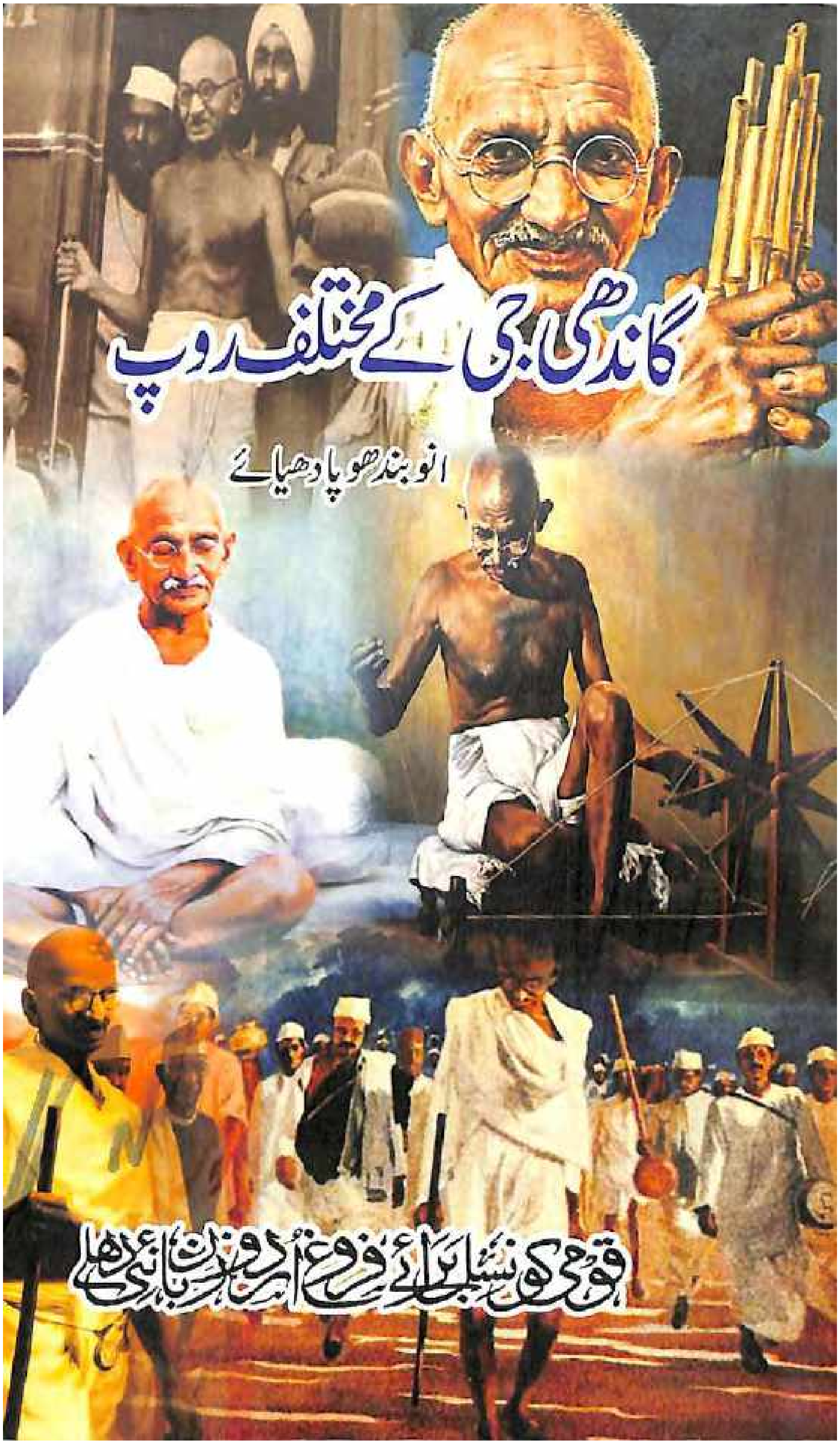

گاندھی جی کے مختلف روپ
انو بندھو پادھیائے
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

گاندھی جی کے مختلف روپ

مصنف

انو بندھو پادھیائے

مترجم

شکیل اختر فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 10025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1974
چوتھی طباعت	:	2011
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/27 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	778

Gandhi Ji Ke Mukhtalif Roop
by
Anu Bandhu Padhyae

ISBN :978-81-7587-573-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025 فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی-6
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho(Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

اپنی والدہ کے نام
جس نے مجھے ہر کام کی قدر کرنا سکھایا۔

پیش لفظ

پردھان منتری بھون،
نئی دہلی۔

یہ کتاب بچوں کے لئے ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ بڑی عمر کے لوگ بھی اسے شوق سے پڑھیں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔

گاندھی جی پہلے ہی ایک یادگار رو داستان کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کو نہیں دیکھا ہے اور خاص طور سے آج کے بچے، وہ ضرور یہ سوچتے ہوں گے کہ گاندھی جی کوئی عجیب انسان تھے یا انسان سے بھی بڑی کوئی چیز تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے کام کر دکھائے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ گاندھی جی کی زندگی کے بالکل عام پہلوؤں کو سامنے لایا جائے جیسا کہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

یہ غیر معمولی بات ہے کہ گاندھی جی نے کس طرح ایک ساتھ اتنی ساری چیزوں میں دلچسپی لی۔ انھوں نے جب کبھی کسی چیز میں دلچسپی لی تو پوری طرح اس میں دل لگایا۔ ان کی یہ دلچسپی سطحی نہیں ہوتی تھی۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف بھی پوری طرح دل لگا کر کام

رہنے کی یہ عادت اُن کی انسان دوستی کو ظاہر کرتی ہے اور یہی اُن کے کردار کی بنیاد تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کتاب میں اُن روزمرہ کے مختلف قسم کے کاموں کا بھی بیان کیا گیا ہے جن میں گاندھی جی سیاسی اور عوامی تحریکوں میں مصروف رہنے کے باوجود دلچسپی لیتے تھے۔ ممکن ہے اس کتاب سے ہمیں گاندھی جی کو اور زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں مدد مل سکے۔

جواہر لال نہرو

نئی دہلی

۱۰ مارچ ۱۹۶۴ء۔

تعارف

اس کتاب کا مسودہ ۱۹۴۹ء سے میرے پاس تھا۔ ۱۹۴۸ء میں کستوربا ٹریننگ کیمپ، بنگال سے کام چھوڑ دینے کے بعد میں نے ڈی۔جی تیندولکر کی کتاب 'مہاتما' کا مسودہ پڑھا۔ میں ایک گاؤں میں کام کر رہی تھی اور وہاں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میرے ارد گرد کام کرنے والے گاؤں کے لوگ اور تربیت حاصل کرنے والی لڑکیاں گاندھی جی کے بارے میں بہت کم جانتی ہیں۔ یہ لوگ گاندھی جینتی مناتے تھے، سوت کاتتے تھے اور ریسپار تھنا کرتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو قومی تحریکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے جیل جا چکے تھے۔ لیکن انھیں بھی اس اصل چیز کی خبر نہیں تھی جسے ہم صرف گاندھی جی کی دین کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، مگر میں نے محسوس یہی کیا تھا۔

مجھے اب بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ جن سے میں اپنی روزانہ کی زندگی میں ملتی ہوں، اُن میں بعض تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں، وہ سب کے سب جسمانی مشقت کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں خود بھی محنت مزدوری کو قابلِ عزت نہیں سمجھتی لیکن

جسمانی مشقت اور اس کی تکلیف سے واقف ہوں اسی لئے میں روزانہ اپنے ملازموں کے ساتھ کچھ دیر کام کرنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ مجھ میں یہ احساس پیدا نہ ہو جائے کہ چند سکے دے کر مجھے دوسروں سے کام لینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔

میں گاندھی جی کو کچھ اس انداز سے پیش کرنا چاہتی تھی کہ ان کا وہ روپ نظر آ جائے جس میں وہ بہت سے ایسے محنت کے کام اپنے ذاتی شوق سے کیا کرتے تھے جن کو دوسرے لوگ دلچسپی کی بنا پر نہیں بلکہ مجبور ہو کر محض روزی کمانے کے لئے کرتے ہیں۔ اسی لئے میں نے بعض واقعات جان بوجھ کر بار بار دہرائے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ گاندھی جی کے اندھے معتقدوں کی تعداد میں کچھ اور اضافہ کروں لیکن میری یہ خواہش ضرور ہے کہ آج کے نوجوان پہلے یہ سمجھ لیں کہ گاندھی جی صرف 'باپوئے قوم' یا 'معمارِ آزادی' ہی نہیں تھے بلکہ کچھ اور بھی تھے۔ اس کے بعد وہ چاہیں تو اُن پر تنقید بھی کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کا مرکزی خیال میرا اپنا ہے یہ کتاب میں نے دس سال سے زیادہ عمر کے بچوں کے لئے لکھی ہے۔ اس کے لئے تقریباً سارا مواد میں نے ڈی۔ جی۔ تندولکر کی کتاب 'مہاتما' سے اخذ کیا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے لئے میں ان کی کتنی احسان مند ہوں اس کا اظہار مشکل ہے۔ مسٹر این۔ جی جوگ نے کتاب کے مسودے کو ایک نظر دیکھنے کی زحمت اٹھائی۔ مسٹر ایم۔ چلاپتی راؤ نے 'نیشنل ہیرالڈ' میں اس سلسلے کے بیس خاکے شائع کرانے کا موقع دیا۔

میں جناب آر۔ کے لکشمن کی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے میری کتاب کے لئے تصویریں تیار کیں۔

میں جواہرلال جی کی بے حد احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے اس کتاب کے لئے پیش لفظ تحریر فرمایا۔

مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر اس کتاب کو پڑھ کر ہزاروں میں سے ایک نوجوان بھی ایسا نکل آئے جو گاندھی جی کے بہت سے کاموں میں سے کسی ایک کام کو بھی اپنا لے گا۔

فہرست

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
محنتی	۱	بنیا	۹۸
بیرسٹر	۶	کسان	۱۰۶
درزی	۱۷	نیلامیا	۱۱۴
دھوبی	۲۰	بھکاری	۱۱۷
نائی	۲۴	لٹیرا	۱۲۶
مہتر	۳۰	جیل کا پنچھی	۱۳۴
موچی	۴۱	جرنیل	۱۴۴
ملازم	۴۹	مصنف	۱۵۵
باورچی	۵۷	صحافی	۱۶۶
ڈاکٹر	۶۴	طابع وناشر	۱۷۵
نرس	۷۳	فیشن ایجاد کرنے والا	۱۸۱
معلم	۷۸	سپیرا	۱۹۱
جولاہا	۸۶	پروہت	۱۹۸
چرخہ چلانے والا	۹۰	زندگی کے واقعات	۲۰۹

محنتی

ایک مصروف بیرسٹر نے اپنے موکلوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مقدمہ بازی میں اپنا وقت اور روپیہ برباد کر کے اپنے آپ کو تباہ نہ کریں اور اپنے معاملات عدالت کے باہر پنچایت کے ذریعہ خود ہی طے کرلیں۔ اپنی فرصت کے اوقات میں بیرسٹر صاحب ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی اور بدھ مذہب کی کتابیں پڑھتے اور بڑے بڑے عالموں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے۔ کتابوں کے اس مطالعہ اور خود اپنی ذاتی سوجھ بوجھ نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ ہر شخص کو روزانہ تھوڑا بہت ہاتھ کا کام بھی کرنا چاہیے۔ محض دماغی محنت کافی نہیں ہے۔ پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ، ڈاکٹر، وکیل، نائی اور بھنگی سب کی محنت کا معاوضہ یکساں ہونا چاہیے۔

انھوں نے آہستہ آہستہ خود اپنی زندگی کے ڈھرے کو بدلا اور جو کام بھی ان کو نظر آیا اس کو کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ایک آشرم میں سیدھی سادی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے کچھ یورپی دوست بھی آشرم میں خاندان کی حیثیت سے رہنے کے لئے شامل ہو گئے۔ آشرم میں سب لوگ محنتی اور حوصلہ مند کسانوں کی طرح رہتے تھے۔ زمین جوتتے اور باغ کی دیکھ بھال کرتے۔ وہاں کوئی تنخواہ دار ملازم نہیں

تھا۔ اس فارم میں سب لوگ خواہ وہ ہندو تھے یا مسلمان، عیسائی تھے یا پارسی، برہمن تھے یا شودر، مزدور تھے یا بیرسٹر، گورے تھے یا کالے، ایک بڑے خاندان کی طرح رہتے اور ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ یہ کھانا مشترکہ باورچی خانے ہی میں تیار ہوتا تھا۔ کھانا بھی سادہ اور کپڑے بھی معمولی۔ ہر شخص کو مہینے بھر کے خرچ کے لئے چالیس روپے ملتے تھے۔ بیرسٹر صاحب بھی اسی رقم میں گزارہ کرتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کی ذاتی آمدنی چار ہزار روپے ماہوار تھی۔ آشرم میں رہنے والے دوسرے لوگوں کی طرح بیرسٹر صاحب بھی بڑی باقاعدگی سے آشرم کے ہر معمول کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ انہیں آرام کرنے کے لئے دن بھر میں مشکل سے چھ گھنٹے مل پاتے تھے۔

اس فارم میں جب ایک جھونپڑی بنائی جا رہی تھی تو اس پر سب سے پہلے وہی چڑھے۔ معمول موٹے نیلے کپڑے کی ڈھیلی ڈھالی دیسی پوشش ان کے جسم پر تھی جس میں بہت سی جیبیں تھیں۔ اور جیبوں میں چھوٹی بڑی کیلیں اور پیچ بھرے ہوئے تھے۔ ایک جیب سے ایک ہتھوڑی نظر آ رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی آری اور ایک برما بھی ان کی پیٹی سے لٹک رہا تھا۔ انھوں نے کئی روز برابر اپنی ہتھوڑی اور آری سے چلچلاتی دھوپ میں کام کیا۔

ایک دن کھانے کے بعد وہ کتابوں کی الماری بنانے بیٹھے۔ انھوں نے سات گھنٹے میں چھت تک اونچی ایک الماری بنا ڈالی۔ آشرم تک جانے والا راستہ کچا تھا۔ اسے پکا کرنے کے لئے ان کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ روزانہ چہل قدمی سے واپسی پر انھوں نے راستے سے چھوٹے چھوٹے کنکر پتھر جمع کرنا شروع کر دیے۔ ان کے ساتھیوں نے بھی ان کی دیکھا

دیکھی ایسا ہی کیا۔ کچھ ہی دنوں میں شرک بنانے کے لئے احاطے میں کنکروں پتھروں کا ڈھیر لگ گیا۔ دوسروں کو کام کی طرف راغب کرنے کے لئے ان کا انداز کچھ ایسا ہی ہوتا تھا۔ آشرم کے سبھی بھی باغبانی کرنے، کھانا پکانے، صفائی کرنے، لکڑی کا کام کرنے، چمڑے کا کام کرنے اور چھاپے خانے کا کام کرنے میں شریک ہوتے تھے۔

انھیں یقین تھا کہ ہماری اس بدحالی کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم معماروں، موچیوں بڑھئیوں، لوہاروں اور نائیوں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں اور ہم نے ان کے پیشوں سے اور اُن کی گھریلو زندگیوں سے خوش اخلاقی، علم، سلیقہ، تہذیب سب کچھ چھین لیا ہے۔ ہم نے ہنرمندی کے کام کو حقیر سمجھا اور کلرکی کو وقعت دی۔ اسی کے نتیجے میں ہم نے غلامی کو خود دعوت دی ہے۔

صبح سویرے بیرسٹر صاحب ہاتھ کی چکّی سے گیہوں پیستے، پھر لباس بدلتے اور پانچ میل پیدل چل کر دفتر جاتے تھے۔ وہ اپنے بال بھی خود کاٹتے، اپنے کپڑے بھی دھوتے اور ان پر استری بھی خود کرتے۔ وہ کبھی کبھی ساری ساری رات جاگ کر طاعون کے مریضوں اور کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ کوڑھیوں کے زخم کو دھونے اور پاخانوں کی صفائی کرنے میں بھی انھیں شرم محسوس نہ ہوئی۔ سستی، کاہلی، خوف اور نفرت کو تو شاید وہ جانتے ہی نہ تھے۔

وہ اپنے رسالے کے لئے مضامین لکھتے، انھیں خود ٹائپ کرتے اور اپنے چھاپے خانے میں ان کو ترتیب دیتے اور اگر ضرورت ہوتی تو ہاتھ سے مشین چلا کر اسے چھاپتے بھی تھے۔

انھیں کتابوں کی جلد بندی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔

وہی تخلیقی ہاتھ جو کبھی جوشیلے اور پُر اثر ادارئیے لکھتا، چرخے پر سوت کات لیتا، کرگھے پر کپڑا بُن لیتا، نئے نئے کھانے بھی پکا لیتا، سوئی سے باریک کام کر لیتا اور پھلوں اور سبزیوں کے پیڑ پودوں کی دیکھ بھال بھی کر لیتا تھا وہی ہاتھ بڑی مہارت کے ساتھ زمین جوتنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا، کنوئیں سے پانی کھینچ لیتا تھا، لکڑی کاٹنے اور چھکڑے پر سے بھاری سامان اتارنے تک کا کام بھی کر سکتا تھا۔

جیل میں انھیں نو گھنٹے تک کدال سے سخت زمین کھودنا پڑتی یا کمبلوں کے پھٹے پرانے کپڑے سینا پڑتے تھے۔ جب وہ بہت زیادہ تھک جاتے تو خدا سے دعا کرتے تھے کہ وہ انھیں کام کرنے کی قوت عطا فرمائے۔ جو کام بھی اُن کے سپرد کیا جاتا اُسے پورا نہ کر سکنے کا خیال ان پر گراں گزرتا تھا۔

آشرم سے قریب ترین شہر بھی چالیس میل دور تھا۔ وہ کئی بار پیدل جا کر وہاں سے آشرم کے لئے سامان لائے۔ ایک بار تو وہ ایک دن میں پچپن میل پیدل چلے۔ رضاکار کی حیثیت سے زخمی سپاہیوں کو اسٹریچر پر لاد کر وہ لگاتار تیس چالیس میل تک پیدل چلے تھے۔ ۸۷ سال کی عمر میں بھی وہ ہفتوں تک روزانہ متواتر اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو ان کے کام کی مدت ۱۲ گھنٹے تک جا پہنچتی۔ اس عمر میں وہ سوائے کتائی کے اور کوئی جسمانی محنت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن گاؤں کی اوس میں بھیگی سردیوں کی ٹھنڈی زمین پر وہ ہر صبح تین میل سے پانچ میل تک ننگے پاؤں ہوا خوری کے لئے

ضرور جاتے۔ کام کرنے کی اس حیرت انگیز لگن اور صلاحیت کی وجہ سے ان کے جنوبی افریقہ کے ساتھیوں نے انھیں "کرم ویر" کا خطاب دیا تھا۔

"کرم ویر" موہن داس کرم چند گاندھی ۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔

بیرسٹر

گاندھی جی نے اٹھارہ برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا اور اس کے بعد جلد ہی قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن چلے گئے۔ وہ پہلے مودھ بنئے تھے جو کسی بیرونی ملک میں گئے۔ انر ٹمپل میں داخلے کے بعد گاندھی جی کو یہ اندازہ ہوا کہ قانون کا امتحان پاس کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ کتنے ہی لوگوں نے نصابی کتابوں کو پڑھے بغیر محض نوٹس پڑھ کر چند ماہ میں امتحان پاس کر لیا تھا۔ نوٹس پڑھ کر امتحانات پاس کر لینے کا آسان نسخہ گاندھی جی کو ٹھیک معلوم نہیں ہوا انھیں فریب پسند نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے کثیر رقم خرچ کر کے اصل درسی کتابیں خریدیں۔ انھیں "قانون عامہ" (COMMON LAW) کی موٹی موٹی جلدوں کو پڑھنے میں تو بہت سخت محنت کرنا پڑی۔ انھوں نے لاطینی زبان سیکھی اور رومن قانون کی کتابوں کے اصل نسخوں کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں بیرسٹروں کو "ڈنر بیرسٹر" کہا جاتا تھا، انھیں کم سے کم ۲۴ دعوتوں میں شرکت کرنا ہوتی تھی اور تین سال کے عرصے میں خود بارہ دعوتیں دینا پڑتی تھیں۔ جن پر خاصی بڑی رقم خرچ ہو جاتی اور یہ تمام رقم طلبا کو خود ہی برداشت کرنا پڑتی تھی۔

گاندھی جی اس طرح کی صحبتوں کے عادی نہ تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

کہ اچھا بیرسٹر بننے کے لئے دعوتیں اڑانے اور شراب پینے سے کیا مدد مل سکتی ہے۔ پھر بھی انھیں ان دعوتوں میں شریک ہونا ہی پڑتا تھا۔ گوشت اور نشیلی چیزوں سے انھوں نے ہمیشہ پرہیز کیا تھا۔ لہذا وہ دسترخوان پر موجود بہت سی چیزوں کو نہیں کھا سکتے تھے اور نہ شراب پی سکتے تھے۔ اسی لئے بہت سے قانون کے طلبا میز پر ان کے ساتھ بیٹھنا چاہتے تھے تاکہ انھیں گاندھی جی کے حصے کی شراب بھی مل جائے۔

ان دعوتوں اور اس مطالعہ کے باوجود گاندھی جی کی شرم اور گھبراہٹ دور نہ ہوئی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آتی تھی کہ کتابی تعلیم مقدمے کی پیروی میں کس طرح کام آ سکتی ہے۔ ایک انگریز وکیل نے ان کی کچھ ہمت بندھائی اور انھیں بتایا کہ ایک اچھا وکیل بننے اور اوسط درجہ کی زندگی گزارنے کے لئے محنت اور ایمان داری سے کام کرنا کافی ہے۔ قانون میں تین چوتھائی حصہ حقیقتوں پر مبنی ہوتا ہے، اگر کسی مقدمے میں ان حقیقتوں کی طرف نظر رکھی جائے تو قانونی گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ اس انگریز وکیل نے گاندھی جی کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ تاریخ اور عام معلومات کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ گاندھی جی نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔

انگلستان میں گاندھی جی نے کچھ عرصہ ایک ہوش مند اور چست انگریز بننے کی کوشش کی۔ انگریزوں کی طرح صحیح لب ولہجے کے ساتھ انگریزی بولنے، تقریر کرنے، ناچنے، وائلن بجانے اور فیشن کے عین مطابق لباس پہننے کی طرف بھی مائل ہوئے۔ لندن میں فیشن کی سب سے بڑی دکان سے انھوں نے ایک سوٹ خریدا، سنہری زنجیر والی ایک جیبی گھڑی بھی خریدی، اونچے

اونچے ہیٹ پہنے، ٹائیاں باندھیں اور نوجوان عورتوں سے جان پہچان بڑھائی۔ اس طرح دھیرے دھیرے وہ آرام دہ اور نمائشی زندگی کی طرف بڑھتے رہے۔ لیکن چند ہی ماہ میں انھیں اپنی اس حماقت کا احساس ہو گیا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ اپنے بڑے بھائی پر ان فضول خرچیوں کا کتنا بوجھ ڈال رہے ہیں۔ انگلستان پڑھائی کی غرض سے آئے ہیں، انگریزوں کی نقل کرنے کے لئے نہیں۔ بس فوراً ہی انھوں نے اپنے طرز زندگی کو بدل ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ اور ایک اسٹوو کرائے پر لے لیا۔ اور اپنا ناشتہ اور رات کا کھانا خود تیار کرنے لگے۔ دوپہر کا کھانا وہ ایک سستے سے ریسٹورنٹ ہوٹل میں کھا لیا کرتے تھے۔ اب وہ سواری پر بھی پیسہ برباد نہ کرتے۔ روزانہ آٹھ دس میل پیدل چل لیا کرتے۔

آخر انگلستان کے ۳۲ مہینے کے بعد وقت آنے پر ان کا نام وہاں کے بیرسٹروں میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے دو دن بعد ہی وہ بحری جہاز سے ہندوستان روانہ ہو گئے۔

ہندوستان پہنچ کر انھوں نے بمبئی میں ایک مکان کرائے پر لیا اور ایک باورچی رکھا۔ شروع شروع میں وہ بڑی پابندی سے ہائی کورٹ جاتے اور یہ دیکھتے رہے کہ وہاں مقدموں کی کارروائی کس طرح چلتی ہے۔ وہ کئی گھنٹے بار کی لائبریری میں گزارتے۔ یہاں انھوں نے ہندوستانی قانون پر بھی کتابیں پڑھیں۔

ان کا پہلا مقدمہ بہت سیدھا سادہ تھا۔ اس مقدمے کی فیس انھیں تیس روپے ملی۔ لیکن جب بائیس سال کا یہ نوجوان اور ناتجربہ کار بیرسٹر بحث کے لئے کھڑا ہوا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اس کا سر چکرانے لگا اور حلق خشک ہو گیا۔ شرمندہ ہو کر وہ

عدالت سے چلا آیا۔ اس کے بعد اس عدالت میں اس نے کسی مقدمے کی پیروی نہیں کی۔

اخراجات بڑھتے جا رہے تھے اور آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ یادداشتیں بہت اچھی طرح لکھ سکتے تھے لیکن یہ کام نہ تو ایک بیرسٹر کے شایانِ شان تھا اور نہ اس کام سے معقول آمدنی ہو سکتی تھی۔ چھ ماہ تک اس آزمائشی ناکام کوشش کے بعد گاندھی جی اپنے بھائی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے پاس راجکوٹ چلے گئے۔ بڑے بھائی ان سے بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ وہ انگلستان سے بیرسٹر بن کر لوٹے ہیں لیکن اُن کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ گاندھی جی کو بھی اس کا بہت رنج تھا۔

راجکوٹ میں ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ قاعدے کے مطابق انھیں ان وکیلوں کو کمیشن دینا چاہیئے تھا جو اُن کو مقدمے دیتے تھے لیکن گاندھی جی نے کمیشن دینے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ کمیشن دینے کو بداخلاقی سمجھتے تھے۔ ان کے بھائی نے بہت سمجھایا۔ مجبوراً گاندھی جی کو کچھ جھکنا پڑا۔ اس وقت گاندھی جی کی آمدنی تین سو روپے ماہوار تھی مگر گاندھی جی نہ تو اس کام سے خوش تھے نہ جھوٹ کے اس جال سے جو اُن کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

خوش قسمتی سے جنوبی افریقہ کے ایک مسلمان تاجر نے ان کی خدمات حاصل کرنا چاہیں۔ ان خدمات کے عوض انھیں کُل ملا کر پندرہ سو پچھتر روپے اور پہلے درجے کا آنے جانے کا کرایہ ملنا تھا۔ انھوں نے یہ پیش کش قبول کر لی اور افریقہ کے دور دراز سفر پر روانہ

ہو گئے۔ انھیں جنوبی افریقہ کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی واقفیت نہیں تھی۔ جب ان کا جہاز زنجبار میں ٹھیرا تو وہ یہ دیکھنے کے لئے نکلے کہ وہاں کی عدالتوں میں کس طرح کام ہوتا ہے۔ کھاتہ نویسی سے متعلق بہت سے سوالات ان کی سمجھ سے باہر تھے اور جس مقدمے کے لئے وہ جنوبی افریقہ جا رہے تھے وہ خاص طور سے حسابات کے بارے میں تھا۔ گاندھی جی نے حسابات پر ایک کتاب خریدی اور اس کا بغور مطالعہ کیا۔

ڈربن پہنچنے کے تیسرے دن گاندھی جی عدالت میں گئے۔ مجسٹریٹ نے ان کو پگڑی اتارنے کا حکم دیا۔ گاندھی جی نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور عدالت سے چلے آئے۔ جب سے انھوں نے جنوبی افریقہ کی زمین پر قدم رکھا تھا وہ برابر یہ دیکھ رہے تھے کہ سفید فام لوگ، ہندوستانیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے ہیں۔ ان کو بھی "بن بلایا مہمان" اور "قلی بیرسٹر" کہا گیا۔ اس توہین اور اس ذلت کی چبھن وہ برابر محسوس کرتے رہے۔

انھوں نے اپنے موکل دادا عبداللہ سے مقدمے کی تفصیل اور معلومات حاصل کیں اور اس مقدمے کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ اگر فریقین وکیلوں پر روپیہ خرچ کرتے رہے تو دونوں ہی تباہ ہو جائیں گے۔ اپنے موکل کو نقصان پہنچا کر روپیہ بٹورنا اور اپنی پوزیشن بڑھانا انھیں پسند نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قانونی مشیر کی حیثیت سے ان کا اصل کام فریقین میں صلح کرانا ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے موکل کو سمجھایا کہ معاملے کو عدالت سے باہر دوسرے فریق سے بات چیت کر کے طے کر لو۔ دادا عبداللہ کو کچھ تکلف ہوا تو گاندھی جی نے کہا "ہمارے آپ کے بیچ جو راز ہے اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ

ہو گی، میں تو مخالف فریق کو صرف یہ مشورہ دوں گا کہ وہ مصالحت کر لیں۔"

گاندھی جی کے واسطہ بننے کے باوجود بھی مقدمہ سال بھر تک کھنچ گیا۔ اس عرصے میں انھیں یہ دیکھنے کا بھی بہتر موقع مل گیا کہ اچھے وکیل اور قانونی مشیر کس طرح کسی پیچیدہ مقدمے کی پیروی کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے شہادت تیار کی۔ آخر معاملات کچھ اس طرح طے ہوئے کہ فریقین مطمئن ہو گئے۔ لیکن گاندھی جی ایسے پیشے سے بہت بددل ہو چکے تھے جو ایک ہی وقت میں دونوں فریقوں کے حق میں قانونی دلیلیں نکال لیتا ہے اور خرچ بڑھاتا رہتا ہے۔

گاندھی جی نے ڈربن کی عدالت میں پریکٹس شروع ہی کی تھی کہ بالاسندرم نامی ایک شخص ان کے دفتر میں آیا۔ اس کے کپڑے بالکل پھٹے ہوئے تھے اور سامنے کے دو دانت بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ یہ شخص ایک مزدور تھا جس کے پاس مزدوری کے لئے تحریری معاہدہ موجود تھا۔ اس کو اس کے گورے آقا نے مار اپیٹا تھا۔ گاندھی جی نے اُس کی دل جوئی کی، ایک گورے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا اور زخم کے تشویشناک ہونے کا میڈیکل سارٹیفکیٹ حاصل کیا۔ پھر انھوں نے بالاسندرم کی طرف سے مقدمہ لڑا اور کامیاب ہوئے۔ اور اس کو ایک بہتر جگہ نوکری دلا دی۔ اس واقعہ نے گاندھی جی کو ہندستانی مزدوروں میں بے حد مقبول بنا دیا۔ اُس وقت سے انھیں بے سہارا اور مجبور لوگوں کے مددگار کے روپ میں دیکھا جانے لگا۔

ایک سال کے تجربے نے گاندھی جی میں اعتماد پیدا کر دیا۔ کچھ تجربات کے بعد آخر

اس "قلی بیرسٹر" کو نٹال کی سپریم کورٹ میں وکالت کرنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن اب بھی گورے وکیل انھیں مقدمے نہیں دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی وکالت کی راہ میں خود بھی بہت سی رکاوٹیں پیدا کر لی تھیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وکالت جھوٹوں کا پیشہ نہیں ہے۔ چنانچہ نہ انھوں نے خود کبھی جھوٹ بولا اور نہ مقدمہ جیتنے کے لئے جھوٹے گواہ تیار کئے۔ ان کا موکل ہارے یا جیتے وہ اپنی مقررہ فیس سے کم یا زیادہ نہیں لیتے تھے۔ اگر موکل سے فیس وصول نہ ہوتی تو وہ کبھی اُسے یاد دہانی نہ کراتے۔ ذاتی شکایتوں پر انھوں نے کبھی کسی کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا۔ جنوبی افریقہ میں ان پر چار بار حملہ ہوا لیکن انھوں نے مجرموں کو عدالت میں لے جانے یا سزا دلانے سے انکار کر دیا۔ اپنی وکالت کے بیس برسوں میں انھوں نے عدالت سے باہر سینکڑوں مقدموں کو طے کرا دیا۔

ایک مرتبہ مقدمے کی پیروی کے دوران انھیں یہ محسوس ہوا کہ موکل بے ایمان ہے۔ چنانچہ انھوں نے پیروی روک دی مجسٹریٹ سے مقدمہ خارج کر دینے کے لئے کہا اور موکل کو ایک جھوٹا مقدمہ لانے کے لئے خوب جھاڑا۔ گاندھی جی نے ایک بار خود کہا تھا کہ "میں نے دوسرے درجے کے وکیل کی حیثیت سے قانون کا کام شروع کیا تھا۔ میرے موکل قانونی معاملات میں میری صلاحیتوں سے متاثر نہ تھے لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ میں حالات سے مجبور ہو کر بھی کبھی سچائی سے نہیں ڈگمگاتا تو وہ مجھ سے قریب ہوتے چلے جاتے۔" ان کے موکل ان کے دوست بن کر ان کے ساتھ کاموں میں شریک ہو گئے۔ دیانت داری اور سچائی کی وجہ سے انھوں نے اپنی اتنی ساکھ قائم کر لی تھی کہ ایک بار انھوں نے اپنے ایک موکل کو جیل جانے

سے بچالیا۔ ان کا یہ پرانا مؤکل کسٹم ڈیوٹی ادا کئے بغیر چوری چھپے سامان منگایا کرتا تھا۔ جب اس کی عزت پر آ بنی تو اس نے گاندھی جی کو سب کچھ صاف صاف بتادیا۔ گاندھی جی نے اُسے یہ مشورہ دیا کہ وہ اقبال جُرم کرلے اور جرمانہ ادا کردے۔ گاندھی جی اٹارنی جنرل اور کسٹم آفیسر سے ملے اور انھیں اصل واقعات بتلا دیئے۔ ان کی رپورٹ کی سچائی پر کوئی شبہ نہیں کیا گیا اور مجرم کو صرف جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اس مؤکل پر اس احسان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اس نے اس پورے واقعہ کو کاغذ پر چھپوا کر اپنے دفتر میں لٹکا دیا۔

ایک دوسرے موقع پر اُن کے مؤکل کے بہی کھاتے میں اندراجات کچھ غلط تھے۔ گاندھی جی نے یہ غلطی مخالف فریق کو بتادی اور بڑی قابلیت کے ساتھ مقدمے کی پیروی کی۔ جج جو پہلے گاندھی جی کو اس دو رُخی وکالت پر الزام دے رہا تھا اس نے فیصلہ گاندھی جی کے مؤکل کے حق میں سنایا اور مخالف فریق سے کہا کہ "فرض کرو گاندھی جی اس غلطی کو تسلیم نہ کرتے تو تم کیا کرتے؟" گاندھی جی بڑی مہارت سے جرح کرتے تھے۔ جج اور وکیل ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے بہت سے مؤکل گورے بھی تھے۔ ہندوستان اور جنوبی افریقہ دونوں جگہ انھوں نے یہ دیکھا تھا کہ ننانوے فی صدی مقدموں میں یورپی لوگوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ اسی لئے انھوں نے کہا تھا کہ "کیا کسی انگریز کو ہندوستان میں وحشیانہ قتل کے بدلے میں موت کی سزا ملی ہے؟ ایک انگریز افسر پر جان بوجھ کر بے گناہ حبشیوں کو جسمانی اذیت دینے کا جرم ثابت ہوگیا لیکن اسے برائے نام سزا دی گئی۔ یہ انصاف نہیں انصاف کا مذاق اڑانا ہے۔"

وہ اصولوں کی سخت پابندی اور قانون کے خلاف بے دھڑک رائے زنی کرنے کے باوجود بھی اپنے پیشے میں کامیاب رہے۔ ہندستان میں ان کی وکالت کی مدت کم رہی۔ لیکن جنوبی افریقہ میں انھوں نے بیس سال وکالت کی۔ شروع میں انھوں نے ایک ابھرتے ہوئے بیرسٹر کے شایانِ شان اچھے سے محلّے میں مکان کرائے پر لیا اور دفتر بنایا اور اسے یورپی انداز سے سجایا۔ اتوار اور دوسری چھٹیوں پر وہ دعوتیں کیا کرتے۔ ان کے گھر کے دروازے سب کے لئے کھلے رہتے اور اپنے قریبی دوستوں اور ماتحتوں کو ساتھ رکھتے۔ ان کا دفتر ان کے گھر سے چھ میل دور تھا۔ چند ماہ تک وہ سائیکل پر آتے جاتے رہے مگر بعد میں انھوں نے دفتر کا راستہ پیدل ہی طے کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ ہندوستانیوں کو ٹرام میں اگلی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے وہ بھی ٹرام میں نہیں جاتے تھے۔ حالاں کہ انھیں اس کی خصوصی اجازت مل سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ انھوں نے غریب ہندوستانی مزدوروں کے دکھ درد کو سمجھنے کی غرض سے خود بھی بہت سادہ زندگی اختیار کرلی۔ چالیس برس کی عمر میں جس وقت ان کی آمدنی چار ہزار روپے ماہوار تھی انھوں نے وکالت چھوڑ دی۔ خود اپنے ہاتھوں سے کام کرنا شروع کیا اور فارم پر رہنے لگے۔

کئی سال بعد ہندوستان میں گاندھی جی نے وکیلوں اور بیرسٹروں کو بڑی بڑی فیس لینے پر برا بھلا کہا۔ یہاں عدالتیں بہت گراں ہیں۔ ان عدالتوں کو عوام کی غربت سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک وکیل پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپیہ مہینہ تک کما سکتا ہے۔

گاندھی جی نے کہا کہ "وکالت سنتؔ کا کاروبار نہیں ہے۔ اگر ہم وکیلوں اور عدالتوں کے چکر میں نہ پھنسے ہوتے تو ہماری زندگی کہیں زیادہ خوش گوار ہوتی۔ وکالت کا پیشہ بد اخلاقی کی تعلیم دیتا ہے۔ دونوں فریقوں کی طرف سے جھوٹے گواہ لا کر کھڑے کر دیے جاتے ہیں جو پیسے کی خاطر اپنا ضمیر بیچ دیتے ہیں۔"

انھوں نے محسوس کیا کہ انصاف کو سستا اور پاک وصاف بنانے کے لئے قانونی ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے خود بغیر فیس لئے غریبوں کے مقدموں کی پیروی کی۔ جب کبھی کوئی مقدمہ قومی کاموں سے متعلق ہوا تو وہ بالکل واجبی اخراجات کے علاوہ کچھ بھی نہیں لیتے تھے۔ جب غریب ہندوستانی نو آباد لوگوں کو میونسپلٹی نے قلیوں کی بستی سے باہر نکال دیا تو گاندھی جی نے کرایہ داروں کا ساتھ دیا۔ انھوں نے ہر مقدمے میں جی جان سے کام کیا اور فی مقدمہ صرف ڈیڑھ سو روپے لئے۔ ان ستر مقدموں میں سے وہ صرف ایک مقدمہ ہارے۔ انھوں نے اس آمدنی میں سے بھی آدھی رقم ایک خیراتی ادارہ کھولنے کے لئے دے دی۔

اپنے ہم وطنوں کو انسانی حقوق دلانے کے لئے انھوں نے حکومت کے خلاف تحریک چلائی۔ انھیں گرفتار کیا گیا، جنوبی افریقہ اور ہندوستان کی عدالتوں میں ان پر مقدمے چلے اور کئی بار انھیں جیل جانا پڑا۔ جنوبی افریقہ کی اسی عدالت میں، جہاں انھوں نے دس سال وکالت کی تھی انھیں ہتھکڑیاں پہنے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔ ہندوستان میں پہلی بار سزا پانے کے بعد ان کا نام بیرسٹروں سے خارج کر دیا گیا۔

گاندھی جی نے برطانوی راج کی عدالتوں سے عدم تعاون کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ

کے نظام کو از سرِ نو زندہ کرنے کا پرچار کیا۔ اس "قانون شکن" کی آواز پر بہت سے بڑے بڑے بیرسٹر وکالت چھوڑ کر تحریکِ آزادی میں شامل ہو گئے۔

وکیلوں کی انجمن کی طرف سے دیئے گئے سپاسنامے کے جواب میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ "مجھے وکیلوں کی جماعت سے اسی ادارے نے نکالا جس نے مجھے وکالت کی سند عطا کی تھی اور اب تو مدت ہوئی کہ میں قانون بھول چکا ہوں"۔ ان کا تعلق قانون کی ترجمانی سے زیادہ قانون شکنی سے رہا تھا۔

درزی

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو دو بار قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ کئی ہفتے تک انھیں دن میں نو نو گھنٹے کمبلوں کے پھٹے پرانے ٹکڑوں کو سینا اور موٹے کپڑے کاٹ کر قمیص کے لئے جیبیں بنانا پڑتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ جب کبھی اپنا پیوند کاری کا کام وقت سے پہلے ختم کر لیتے تو اور کام بھی مانگ لیتے تھے۔

ایک ہندوستانی جیل میں کچھ دنوں تک انھوں نے سنگر سلائی مشین پر بھی کام کیا۔ یہ کام انھوں نے خود لیا تھا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ سلائی مشین چلانے میں انھیں پوری مہارت حاصل ہو جائے۔ وہ ایسی بڑی بڑی مشینوں کے استعمال کے خلاف تھے جو مزدوروں کی روزی چھین لیں اور انسان کو سرمایہ داروں کی مشینوں کا غلام بنا دیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مشین انسان کو معمولی محنت اور مشقت سے بھی روکے تو ایسی مشینوں کے استعمال کی اجازت نہیں ملنی چاہیئے۔ ہندوستان میں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کروڑوں آدمیوں پر سے کام کا بوجھ کم کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کے لئے کام مہیا کیا جائے۔ سلائی کی مشین کے البتہ وہ مخالف نہیں تھے کیوں کہ اب تک جو کار آمد ایجادیں ہوئی ہیں ان میں

ایک سلائی کی مشین بھی ہے۔ سلائی اور بخیہ کے کام میں اپنی بیوی کی پریشانیاں دیکھ کر سنگر کے دل میں ایسی مشین بنانے کا خیال آیا اور اس نے بیوی کی محبت میں اس کو اس مشقت سے بچانے کے لئے سلائی کی مشین ایجاد کر ڈالی۔ دراصل اس مشین کی ایجاد کے پیچھے محبت کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔

گاندھی جی نے ایک بار اپنے آشرم کی ایک خاتون کو لکھا تھا کہ "اپنی شلوار قمیض کی سلائی کے لئے تم پریشان نہ ہو۔ میں ہر طرح کا لباس تیار کر سکتا ہوں۔ ہم آسانی سے سلائی کی ایک مشین حاصل کر سکتے ہیں جس کی مدد سے چند گھنٹوں میں ضروری لباس تیار ہو سکتا ہے" انھیں سوئی سے کپڑے سینے پر بجا طور پر فخر تھا۔ وہ اپنی بیوی کے بلاؤز کی کٹائی اور سلائی کر لیتے تھے وہ چرخے پر سوت کاتتے۔ پھر کرگھے پر اس سوت سے کپڑے بنتے اور اس کپڑے سے اپنے لئے کرتا سی لیتے تھے۔ ویسے آشرم میں تربیت پانے والوں کو ماہر درزی اور موچی مفت تعلیم دیتے تھے۔

گاندھی جی جس وقت نیل کے کارخانہ داروں کی زیادتیوں کے خلاف چمپارن کے کاشتکاروں کی رہنمائی کر رہے تھے تو ایک برطانوی صحافی نے انھیں بدنام کیا۔ اس نے کہا کہ گاندھی جی نے محض کاشتکاروں کا دل جیتنے کے لئے وقتی طور پر قومی لباس اختیار کیا ہے۔ گاندھی جی نے اس کے جواب میں لکھا کہ "سودیشی چیزوں کے استعمال کا عہد کرنے کے بعد سے جو کپڑے میں پہنتا ہوں وہ میرے یا میرے ساتھیوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے اور سلے ہوئے ہوتے ہیں"

گاندھی جی نے بعد میں کُرتا پہننا بھی چھوڑ دیا تھا اور چادر اوڑھنے اور لنگوٹی باندھنے لگے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی وہ اپنے رومال، انگوچھے اور لنگوٹی کے کناروں کی تُرپائی خود کر لیتے تھے۔ وہ سلائی کرتے وقت بھی اپنے سکریٹری سے خطوط لکھواتے رہتے تھے اور خط کا مضمون بولتے جاتے تھے۔ آغا خاں محل میں اپنی قید کے زمانے میں انھوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو اس کی سال گرہ پر کھادی کے کچھ رومال تحفے میں دیے تھے۔ گاندھی جی نے ہر رومال پر بڑی خوب صورتی سے سپرنٹنڈنٹ کے نام کا پہلا حرف کاڑھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۴ برس کی تھی۔

ایک مرتبہ ایک خاتون نے گاندھی جی کی نگرانی میں ان کی پسندیدہ شال پر کھادی کے ٹکڑوں سے کام کیا تھا۔ اسی پیوند لگی شال کو اوڑھ کر گاندھی جی اپنے غریب ہم وطنوں کے نمائندے کی حیثیت سے برطانوی وزیر اعظم کے ساتھ گول میز کانفرنس میں بیٹھے اور بکنگھم محل میں ایک چائے کی دعوت میں شریک ہوئے۔ انھیں کپڑوں کی نمائش پسند نہیں تھی لیکن بد نما اور پھٹے ہوئے کپڑوں سے انھیں نفرت تھی۔ ایک بار ایک جلسے میں انھوں نے اپنے ساتھی کی شال میں سوراخ دیکھا تو فوراً اُسے یہ لکھ بھیجا کہ: "پھٹے ہوئے کپڑے پہننا کاہلی کی علامت اور اسی لئے شرم کی بات ہے۔ ہاں پیوند لگے کپڑے مفلسی نفس کشی اور جفاکشی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے تمھاری چادر میں سوراخ گوارا نہیں۔ یہ غریبی اور سادگی کی علامت نہیں۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ یا تو تم غیر شادی شدہ ہو یا تمھاری بیوی پھوہڑ ہے یا تم خود کاہل آدمی ہو۔"

دھوبی

بیرسٹر گاندھی صاف ستھرے یورپی لباس میں کچہری جایا کرتے تھے۔ اپنی قمیض میں وہ روزانہ ایک صاف کالر لگاتے تھے۔ ہر دوسرے دن قمیض بدلتے تھے اسی لئے ان کا دھلائی کا خرچ خاصا تھا۔ دھوبی اکثر کپڑے دیر سے دیتا تھا۔ اس لئے گاندھی جی کو کئی جوڑے کپڑے رکھنے کے لئے بہت خرچ کرنا پڑتا تھا۔ دھوبی کی اس مہربانی کا ساتھ دینے کے لئے تین درجن قمیضیں اور کالر بھی ناکافی تھے۔

گاندھی جی اپنے اخراجات کم کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن وہ کپڑے دھونے کا مکمل سامان لے آئے۔ انھوں نے کپڑوں کی دھلائی پر ایک کتاب خریدی اور اس کا بغور مطالعہ کیا۔ جب انھیں کپڑوں کو دھونے کی ترکیبیں اچھی طرح معلوم ہوگئیں تو انھوں نے ان ترکیبوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ بے چاری کستورباکو بھی انھوں نے نہیں بخشا۔ گاندھی جی نے ان کو بھی کپڑے دھونے کا فن سکھایا۔ اس نئے خبط نے گاندھی جی کے روزانہ کے معمول پر مزید بوجھ ڈال دیا۔ لیکن وہ ہار ماننے والے نہیں تھے۔ انھوں نے دھوبی کی اس مصیبت سے چھٹکارا پانے اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن انھوں نے کالر دھویا اور اس پر کلف چڑھایا۔

اس کام سے وہ ابھی پوری طرح واقف نہیں تھے اس لئے انھوں نے کالر جلنے کے ڈر سے کم گرم استری سے کالر کو خوب دبایا اور وہی کالر لگا کر کچہری چلے گئے۔ بہت زیادہ کلف لگنے کی وجہ سے کالر اکڑ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کے دوست ان پر ہنسنے لگے لیکن گاندھی جی ذرا بھی نہیں جھینپے۔ انھوں نے کہا "کپڑے دھونے کی یہ میری پہلی کوشش ہے اس لئے کلف زیادہ ہو گیا ہے۔ لیکن کوئی حرج نہیں یہی کیا کم ہے کہ آپ کی تفریح کا سامان تو ہو گیا ۔"

ایک دوست نے پوچھا" لیکن کیا یہاں لانڈریوں کی کمی ہے ؟"

"نہیں ۔ لیکن، دُھلائی کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ ایک کالر کی دھلائی تقریباً اس کی قیمت کے برابر ہے۔ اور پھر دھوبی کے آسرے پر رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے میں اپنے کپڑوں کو خود دھو لینا بہتر سمجھتا ہوں۔" بعد میں انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ بڑے ماہر دھوبی ہیں ۔

ایک مرتبہ گوکھلے، گاندھی جی کے ساتھ ٹھہرے۔ گاندھی جی اُن کا احترام بالکل ایک گورو کی طرح کرتے تھے۔ گوکھلے کو کسی اہم دعوت میں شریک ہونا تھا۔ ان کے دوشالہ میں شکنیں پڑ گئی تھیں اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ اُسے دھوبی سے دھلوایا جا سکتا۔ گاندھی جی نے ان سے کہا کہ میں اس پر استری کئے دیتا ہوں۔ گوکھلے نے جواب دیا "میں آپ پر ایک وکیل کی حیثیت سے تو بھروسہ کر سکتا ہوں لیکن دھوبی کی حیثیت سے نہیں کر سکتا ۔" لیکن گاندھی جی نے اصرار کیا اور دوشالہ پر استری کر دی۔ گوکھلے ان کے

کام سے بہت خوش ہوئے۔ اس پر گاندھی جی کو اتنی خوشی ہوئی کہ انھوں نے کہا۔ "اب اگر ساری دنیا بھی میری اس صلاحیت کو تسلیم نہ کرے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں"۔

جنوبی افریقہ کے آشرم میں پانی کی بڑی قلت تھی اور عورتوں کو کپڑے دھونے کے لئے دور ایک چشمے پر جانا پڑتا تھا۔ گاندھی جی ان کی بڑی مدد کرتے تھے۔ کھادی کے ابتدائی دور میں کرگھوں پر بہت موٹی اور بھاری ساڑیاں تیار ہوتی تھیں۔ آشرم کی عورتیں ان کو پہننے کے لئے تو راضی ہو گئیں لیکن ان کو دھوتے وقت بہت بڑبڑاتی تھیں گاندھی جی نے ان سے کہا کہ میں ان ساڑیوں کو دھو دیا کروں گا۔ انھیں دوسروں کے کپڑے دھونے میں بالکل عار نہ تھا۔ ایک بار وہ کسی دولت مند کے یہاں مہمان ہوئے۔ جب وہ نہانے کے لئے غسل خانے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھری دھوتی فرش پر پڑی ہے۔ نہا دھو کر فارغ ہوئے تو انھوں نے اپنی دھوتی کے ساتھ اس دھوتی کو بھی دھو ڈالا۔ اور دھوپ میں سکھانے کے لئے باہر لے آئے۔ وہ سفید کپڑوں کو دھوپ میں ضرور سکھاتے تھے۔ کیوں کہ دھوپ جراثیم کو بھی مارتی ہے اور کپڑوں میں چمک بھی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی کو دھوتیاں پھیلاتے دیکھ کر میزبان نے کہا "باپو جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ دھوتی کچھ میلی ہو گئی تھی اس لئے میں نے اسے بھی دھو دیا۔ چیزوں کو صاف رکھنے کے لئے تھوڑی سی محنت کرنے میں مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی" اور واقعی گاندھی جی تو نہیں البتہ ان کے میزبان بہت شرمندہ ہوئے۔

گاندھی جی بوڑھے ہو گئے تھے پھر بھی وہ جیل میں اکثر اپنی دھوتی، رومال اور

انگوچھا دھو لیا کرتے تھے اور خود زیادہ کام کر کے اپنے ساتھیوں کا کام ہلکا کر دیتے تھے۔ آغا خاں محل میں کستوربا جب آخری بار بیمار ہوئیں تو گاندھی جی ان کے استعمال کئے ہوئے رومال دھو ڈالتے تھے۔

انھیں ساری زندگی اپنے لباس کا بڑا خیال آیا۔ وہ جب چھوٹے سے تھے تو اپنی ململ کی دھوتی کو صاف دھونے میں دوسرے بچوں سے بازی لے جاتے تھے۔ وہ خود کنوئیں سے پانی لاتے تھے۔ گاندھی جی کو سادگی پسند تھی لیکن انھیں گندے اور کپڑوں پر پڑی ہوئی شکنوں سے بڑی نفرت تھی۔ اپنی دھوتی، چادر اور انگوچھے کو وہ دھبوں اور شکنوں سے پاک رکھتے تھے۔ وہ صفائی اور ستھرائی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

نائی

جنوبی افریقہ پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد ہی گاندھی جی کو ایک بڑے شہر میں رات بسر کرنی پڑی۔ وہاں وہ اپنی وکالت کے سلسلے میں گئے تھے۔ انھوں نے کرائے کی گھوڑا گاڑی پر بیٹھ کر کوچوان سے کہا کہ وہ انھیں کسی بڑے ہوٹل میں لے چلے۔ گاندھی جی ہوٹل پہنچے اور منیجر سے ایک کمرہ طلب کیا۔ گورے منیجر نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا اور بولا "معاف کیجیے، اس وقت کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔" گاندھی جی کو وہ رات ایک ہندوستانی دوست کی دوکان میں گزارنی پڑی۔ جب انھوں نے اپنے دوست سے ہوٹل والا واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا کہ "آپ کو یہ امید کیوں کر ہوئی کہ یہاں کسی ہوٹل میں آپ کو جگہ مل سکے گی؟" گاندھی جی نے تعجب سے پوچھا "کیوں؟" ان کے دوست نے بتایا "وقت پڑنے پر آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" جنوبی افریقہ کے ہندوستانی جو ذلت برداشت کر رہے تھے اس کے متعلق جلد ہی گاندھی جی کو بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ ان کے گھونسے، تھپڑ اور لاتیں پڑیں اور فٹ پاتھ پر سے دھکا دیا گیا۔ کیوں کہ وہ کالے ہندوستانی تھے پھر بھی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ گورے لوگ کالوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں اور ان کے ساتھ

بُرا سلوک کیوں روا رکھتے ہیں۔ کیا تمام انسان ایک ہی خدا کی مخلوق نہیں ہیں اور کیا عیسائی مذہب محبت نہیں سکھاتا؟

ایک روز گاندھی جی بال کٹوانے ایک دوکان پر گئے۔ گورے حجام نے پوچھا "کہیے کیا چاہیے؟"

گاندھی جی نے کہا "میں بال کٹوانا چاہتا ہوں۔"

"معاف کیجیے۔ میں آپ کے بال نہیں کاٹ سکتا۔ میں نے کسی کالے آدمی کے بال کاٹے تو میرے گاہک میرے پاس آنا چھوڑ دیں گے۔"

گاندھی جی اس ذلت کو اپنے ذہن سے کبھی نہ نکال سکے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ دل ہی دل میں کڑھنے یا اخباروں میں اپیلیں کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ انھیں اپنی ذات پر بھروسہ کرنا اور اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہوگا کہ اپنے کام خود کر سکیں۔ انھوں نے فوراً بال کاٹنے کی ایک مشین خریدی اور گھر پہنچے۔ آئینے کے سامنے انھوں نے اپنے بال کاٹنے شروع کر دیے۔ وہ اپنے آپ شیو تو کر سکتے تھے لیکن اپنے بال آپ کاٹنا ذرا ٹیڑھا کام تھا یقیناً یہ کام ایک بیرسٹر کا نہیں تھا! بہر حال انھوں نے کسی نہ کسی طرح بال کاٹ لیے لیکن پُشت کے بالوں کا ستیاناس ہو گیا۔ اگلے دن وہ اپنی مخصوص بے پروائی کے ساتھ کچہری گئے۔ سخروں جیسے کٹے بال دیکھ کر ان کے دوستوں نے خوب مذاق اڑایا۔ ایک صاحب نے پھبتی کسی۔ پوچھا "گاندھی جی آپ کے بالوں پر کیا مصیبت نازل ہوئی۔ کیا رات کو چوہے بال کتر گئے۔" گاندھی جی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جی نہیں، بلکہ

گورے نائی نے ایک کالے آدمی کے کالے بال کاٹنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے میں نے خود بال کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے خواب کٹنے کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔"

بال کاٹنے کی یہ پہلی کوشش تھی جو ۴۰ سال کی عمر میں گاندھی جی نے کی۔ پھر تو انھوں نے بارہا قینچی اور مشین سے بال کاٹے۔ ان کے آشرم میں نائی سے بال کٹوانے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے آشرم میں رہنے والے باری باری ایک دوسرے کے بال کاٹا کرتے تھے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ آشرم کے طالب علم سادہ اور محنت زندگی گزاریں۔ اس لئے فیشن، عمدہ لباس یا لذیذ کھانوں کی اجازت وہاں نہیں تھی۔ ایک اتوار کی صبح لڑکے نہانے جا رہے تھے۔ گاندھی جی نے ایک ایک کر کے انھیں بلایا اور ان کے بال کاٹ دیے۔ لڑکے بہت خفا ہوئے کہ انھیں گنجا کر دیا گیا۔ ایک بار تو گاندھی جی نے آشرم کی ایک لڑکی کے لمبے لمبے بال بھی کاٹ دیے تھے۔

جنوبی افریقہ کے جیلوں میں قیدیوں کو کنگھا نہیں دیا جاتا تھا، اور دو مہینے یا اس سے زیادہ کی سزا پانے والے ہر قیدی کا سر اور داڑھی مونچھ مونڈ دی جاتی تھی۔ گاندھی جی اور ان کے باقی ساتھی اس سزا سے بچے ہوئے تھے۔ لیکن گاندھی جی جیل کے سارے تجربات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لئے جب گاندھی جی نے جیلر کو لکھا کہ وہ اپنے بال کاٹنا چاہتے ہیں تو جیلر نے گاندھی جی کو بال کاٹنے کی مشین اور ایک قینچی منگوا دی۔ گاندھی جی اور ان کے چند ایک جیل کے ساتھی روزانہ دو گھنٹے بال کاٹتے تھے۔

وہ آغا خاں کے محل میں قید تھے ان کے ساتھ آشرم کی ایک خاتون بھی تھیں۔

وہ اپنے بالوں کی خشکی سے بہت پریشان تھیں۔ ایک دن وہ گاندھی جی سے پوچھ بیٹھیں "باپو! کیا میں خشکی دور کرنے کے لئے اپنے بال کاٹ لوں اور کوئی دوا لگاؤں؟" گاندھی جی نے فوراً ہی جواب دیا "ضرور ضرور، یہ کام فوراً کر ڈالو۔ ذرا قینچی تو لاؤ" قینچی آئی اور ان صاحبہ کے بالوں کی ساری لٹیں کٹ کر گر گئیں۔ "نائی مہاتما" کی عمر اس وقت پچھتر برس کی تھی۔

سودیشی تحریک کے زمانے میں گاندھی جی نے بدیشی استروں کا استعمال چھوڑ دیا اور دیسی استرے سے کام چلانے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ ٹھیک ڈھنگ سے استرا استعمال کرنے لگے اور آئینے، صابن اور برش کے بغیر شیو کر لیا کرتے۔ انھیں یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ اس طرح شیو کرنے کے فن میں انھوں نے قابلِ ذکر مہارت حاصل کر لی ہے۔ ایک نائی کو انھوں نے یہ سرٹیفکیٹ دیا تھا "منی لال نے بڑے شوق سے میرا شیو کیا۔ اس کے پاس دیسی استرا ہے اور وہ بغیر صابن لگائے شیو کرتا ہے"۔ گاندھی جی کے پیروکاروں کو بھی ان کا یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح شیو کرنے میں کوئی ہتک نہیں ہے۔

گاندھی جی کو معلوم تھا کہ گاؤں کے نائی جراح کا کام بھی کرتے ہیں۔ وہ بڑی مہارت سے پھوڑے کی جراحی کر لیتے ہیں، چبھے ہوئے کانٹے نکال دیتے ہیں لیکن گاندھی جی کو اُن کے میلے کپڑے اور گندے اوزار سخت ناگوار گزرتے تھے۔

ایک مرتبہ سیوا گرام میں ایک ہریجن خدمت گار نے کہا کہ "میں شیو کروانے

کے لئے داردھا جانا چاہتا ہوں "

"کیا تم اس گاؤں میں حجامت نہیں کروا سکتے ؟"

اس نے جواب دیا "سورن نائی میرا شیو نہیں کریں گے اور یہاں کوئی ہریجن نائی نہیں ہے "

گاندھی جی نے کہا " پھر میں اس سورن نائی سے کس طرح شیو کروا سکتا ہوں؟" انھوں نے بھی اس سورن نائی سے شیو کروانا چھوڑ دیا ۔ انھیں روزانہ گاؤں گاؤں پھرنا پڑتا تھا اور شیو کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا ۔ اس لئے وقت بے وقت انھیں نائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ۔

کھادی یاترا کے دوران انھوں نے ایک کھادی پوش نائی سے شیو کرانے کی خواہش ظاہر کی ۔ والنٹیر ادھر اُدھر ایسے نائی کی تلاش میں گئے ۔ گاندھی جی نے ان سے کہا تھا کہ "ہمیں اپنی سودیشی تحریک میں دھوبیوں اور نائیوں کو بھی شریک کرنا ہوگا ۔ نائی خاصے باتونی ہوتے ہیں وہ سودیشی تحریک کے پیغام کو خوب پھیلا سکتے ہیں " ایک اور موقع پر اڑیسہ میں گاندھی جی ایک نائی کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ انھوں نے دیکھا ایک عورت شیو کرنے کا مکمل سامان لئے چلی آرہی ہے ۔ وہ بھاری بھاری جھمکے، نتھ، ہنسلی ، کڑے اور سنہری چوڑیاں پہنے تھی ۔ گاندھی جی نے اس سے پوچھا " کیا تم میرا شیو کروگی ؟" اس نے مسکرا کر گردن ہلائی اور اپنا اُسترا تیز کرنے لگی ۔ گاندھی جی نے اس سے پھر پوچھا " یہ تم اتنے بھاری بھاری زیور کیوں پہنے ہو ؟ ان بھدے اور میلے زیورات سے تمہاری

خوب صورتی میں بھی تو اضافہ نہیں ہوتا۔" اس عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ بولی" آپ کو کیا معلوم کہ یہ زیور میں نے محض آج اس خاص موقع کے لئے حاصل کئے ہیں۔ آپ جیسے بڑے آدمی کے سامنے میں بغیر زیور پہنے کس طرح چلی آتی" گاندھی جی کے سر کے بال کاٹنے اور شیو کرنے کے بعد اس عورت نے اپنی اُجرت کے پیسے ان کے قدموں میں ڈال دیے، اُن کے آگے جھکی اور واپس چلی گئی۔

مہتر

راجکوٹ میں گاندھی جی کے گھر میں اُدکا نامی ایک بھنگی کام کیا کرتا تھا۔ گاندھی جی اگر کبھی اُدکا کو چھو لیتے تھے تو پتلی بائی ان سے نہانے کے لئے کہتی تھیں۔ گاندھی جی یوں تو بڑے اطاعت شعار اور فرمانبردار بیٹے تھے لیکن انھیں ماں کی یہ بات پسند نہیں تھی۔ بارہ سال کا یہ بیٹا اپنی ماں سے بحث کرتا کہ اُدکا تو کوڑا کرکٹ اور گندگی صاف کرکے ہماری بڑی خدمت کرتا ہے پھر اس کو چھو کر میں ناپاک کس طرح ہو سکتا ہوں؟ میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا لیکن رامائن میں لکھا ہے کہ رام نے ایک چنڈال گوہا کا کو گلے لگا لیا تھا۔ رامائن ہم کو گمراہ نہیں کر سکتی۔" پتلی بائی یہ دلیل سُن کر لاجواب ہو جاتی تھیں۔

بھنگیوں کا کام گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں سیکھا تھا۔ وہاں ان کے دوست پیار سے انھیں "مہترِ اعظم" کہا کرتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں تین سال کے قیام کے بعد گاندھی جی اپنے بیوی بچوں کو لینے ہندوستان آئے۔ اسی زمانے میں پریسی ڈینسی میں پلیگ پھوٹ پڑا۔ اور راجکوٹ میں بھی وبا پھیل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ گاندھی جی

نے فوراً راجکوٹ کے حفظانِ صحت کو بہتر بنانے کے لئے اپنی خدمات پیش کردیں۔ انھوں نے ہر گھر کا معائنہ کیا اور پاخانوں کو صاف رکھنے پر زور دیا۔ کیڑوں سے بھرے ہوئے تاریک اور غلیظ گڑھوں کو دیکھ کر انھیں بڑی وحشت ہوئی۔ اونچے طبقے کے مکانوں میں نالیوں کو پاخانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کی بدبو، ناقابلِ برداشت ہوتی تھی مگر گھر والوں کو بدبو کا احساس تک نہ ہوتا۔ اُن کے مقابلے میں غریب اچھوتوں کے گھر زیادہ صاف تھے۔ گویا گاندھی جی کے پرچار کا ان پر زیادہ اثر ہوا تھا۔ گاندھی جی نے پیشاب اور پاخانے کے لئے الگ الگ بالٹیوں کے استعمال کا مشورہ دیا۔ اُن کے خیال میں اس طرح صحت وصفائی کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

راجکوٹ میں گاندھی جی کے خاندان سے سب ہی واقف تھے۔ راجکوٹ اور قریب کی ریاستوں میں گاندھی جی کے والد اور دادا عرصے تک دیوان رہ چکے تھے۔ تقریباً ستر سال کے بعد دیوان جی کے بیرسٹر لڑکے کو اپنے شہر کی صفائی اور گھر گھر جاکر گندی نالیوں کا معائنہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن گاندھی جی نے اس موقع پر ہمت اور جرأت سے کام لیا۔ انھوں نے رہن سہن کے بہت سے مغربی طور طریقوں پر نکتہ چینی کی تاہم اس بات کا بار بار اقرار کیا کہ انھوں نے صفائی اہلِ مغرب ہی سے سیکھی ہے۔ صفائی ستھرائی کے اسی معیار کو وہ ہندوستان میں بھی مقبول بنانا چاہتے تھے۔

جنوبی افریقہ سے دوسری بار ہندوستان آنے پر گاندھی جی کلکتے کے کانگریس اجلاس میں شریک ہوئے۔ وہ جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانیوں کی خراب حالت

سے روشناس کرانے اور ان کے لئے مدد حاصل کرنے آئے تھے۔ کانگریس کیمپ میں نالیوں کی حالت بے حد خراب تھی۔ کچھ نمائندے اپنے کمروں کے آگے برآمدوں کو پاخانہ بنائے ہوئے تھے۔ دوسروں کو اس پر اعتراض بھی نہیں تھا لیکن گاندھی جی خاموش نہ رہ سکے۔ لیکن جب انھوں نے والنٹیروں سے صفائی کرنے کے لئے کہا تو وہ بولے "پاخانہ صاف کرنا ہمارا کام نہیں ہے یہ تو بھنگیوں کا کام ہے۔" اس پر گاندھی جی نے ایک جھاڑو منگائی اور خود ساری گندگی صاف کردی۔ اس وقت وہ یورپی لباس پہنے ہوئے تھے۔ والنٹیروں کو بہت تعجب ہوا مگر کوئی ان کی مدد کو نہ بڑھا۔ اس واقعہ کے برسوں بعد جب گاندھی جی انڈین نیشنل کانگریس کے "رہنما" بن گئے تو والنٹیروں نے کانگریس کیمپ میں ایک بھنگی دستے کی بھی تنظیم کی۔ ایک مرتبہ تو صرف برہمنوں ہی نے بھنگیوں کا کام کیا تھا۔ ہری پورہ کانگریس کی صفائی کے لئے دو ہزار اُستاد اور طالب علموں کو خاص طور سے تربیت دی گئی تھی۔ گاندھی جی یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ گندگی اور کوڑے کرکٹ کی صفائی "اچھوت" کہلانے والا ایک ہی طبقہ کرے۔ وہ تو ہندوستان سے چھوت چھات بالکل ختم کردینا چاہتے تھے۔

جنوبی افریقہ میں انگریز ہندوستانیوں کو ان کی گندی عادتوں کی وجہ سے نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گاندھی جی نے ان کے گھروں کو جاکر دیکھا اور ان سے مکانوں اور اردگرد کی صفائی رکھنے کے لئے کہا۔ انھوں نے اس سلسلے میں تقریریں کیں اور اخباروں میں بھی بہت کچھ لکھا۔ ڈربن میں گاندھی جی کا مکان مغربی طرز کا تھا۔

غسل خانے میں پانی کے نکاس کے لئے کوئی نالی نہیں تھی کموڈ اور پیشاب دان کا استعمال ہوتا تھا۔ گاندھی جی کبھی کبھی ساتھ میں رہنے والے اپنے کلرک کا پاٹ بھی صاف کردیا کرتے تھے اور اپنی بیوی کستوربا کو بھی تاکید کرتے کہ وہ بھی یہ پاٹ صاف کیا کریں۔ انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے بیٹوں کو بھی یہ کام سکھایا۔ ایک بار کستوربا نے معمولی ذات کے کلرک کا پاٹ اٹھاتے وقت بہت ناک بھوں چڑھائی۔ گاندھی جی نے بہت سختی سے ان سے کہا کہ اگر تمھیں ذات پات کا ایسا ہی خیال ہے تو اس گھر سے نکل جاؤ۔ ایک بار ان کے قریبی ہمدردوں نے صرف اس بنا پر ان سے بول چال بند کردی تھی کہ انھوں نے ایک اچھوت جوڑے کو سابرمتی آشرم میں داخلے کی اجازت دے دی تھی۔

ایک مرتبہ جنوبی افریقہ کی ایک جیل میں انھوں نے پاخانوں کی صفائی کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔ اگلی مرتبہ جیل کے ذمہ داروں نے بھنگی کا کام ان کے ہی سپرد کر دیا۔

جنوبی افریقہ میں بیس سال رہنے کے بعد ۱۹۱۵ء میں جب ان کی عمر ۴۶ برس کی تھی گاندھی جی اپنی پوری جماعت کے ساتھ مستقل طور پر ہندوستان آگئے۔ اسی سال وہ ہردوار میں کمبھ میلا دیکھنے گئے۔ میلے کے زمانے میں اپنے فینکس آشرم کے لڑکوں کے ساتھ بھنگیوں کی طرح کام کیا۔ اسی سال گاندھی جی پونا میں "بھارت سیوک سنگھ" کے کوارٹر دیکھنے گئے۔ اس چھوٹی سی بستی کے چند لوگوں نے ایک صبح

گاندھی جی کو پاخانے صاف کرتے ہوئے دیکھا۔ انھیں یہ بات ناگوار ہوئی لیکن گاندھی جی کو یقین تھا کہ اس طرح کے کام کرکے ہی آدمی اپنے آپ کو آزادی کے قابل بنا سکتا ہے۔

انھوں نے کئی بار پورے ہندستان کا دورہ کیا۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے انھوں نے کسی نہ کسی صورت میں صحت و صفائی کی کمی پائی۔ دھرم شالاؤں اور ریلوے اسٹیشن کے پاخانوں اور پیشاب خانوں کی گندگی اور بدبو تو بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ راستے جن پر غریب دیہاتی یا ان کے مویشی آتے جاتے تھے بدانتظامی کا شکار تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک تیرتھ استھان پر دیکھا کہ جس تالاب میں لوگ ڈبکیاں لگا رہے ہیں اس کا گھاٹ اور پانی بہت گندہ ہے۔ اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتا بلکہ ندی کے کناروں پر لوگ خود گندگی پھیلاتے ہیں۔ انھیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ کاشی وشوا ناتھ مندر کے سنگ مرمر کے فرش پر جو چاندی کے سکّے جڑے ہوئے تھے ان میں کیچڑ اور میل جم گیا ہے۔ انھیں اس پر بھی حیرت تھی کہ مندروں کو جانے والے راستے تنگ کیوں ہوتے ہیں اور ان میں کیچڑ اور پھسلن کیوں ہوتی ہے۔ گاندھی جی کو اس پر بھی افسوس ہوتا تھا کہ ریل کے ڈبوں کو مسافر گندہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے تھے ہندوستان میں اگرچہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو جوتا خرید سکیں پھر بھی یہاں سڑکوں پر اتنی گندگی رہتی ہے کہ ننگے پیر چلنے کی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ بمبئی جیسے شہر میں بھی لوگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں گھروں میں رہنے والے اُن کے اوپر تھوک نہ دیں۔

ایک میونسپل سپاسنامے کے جواب میں گاندھی جی نے کہا تھا "میں آپ کو اس شہر کی کشادہ سڑکوں، شاندار روشنی اور خوب صورت پارکوں پر مبارک باد دیتا ہوں۔ لیکن اس میونسپلٹی کو جس کے مثالی پاخانے نہ ہوں اور جس کی سڑکیں اور گلیاں دن رات صاف نہ رہتی ہوں اُسے باقی رہنے کا حق نہیں۔ میونسپلٹیوں کے لئے گندگی کو دور کرنے کا مسئلہ ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے..... کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ بھنگی کس حالت میں رہتے ہیں؟" وہ عوام سے کہتے تھے "جب تک آپ خود ہاتھوں میں جھاڑو اور ٹوکرا نہیں لیں گے آپ اپنے شہروں کو صاف ستھرا نہیں رکھ سکتے۔"

ایک ماڈل اسکول کو دیکھنے کے بعد انھوں نے وہاں کے استادوں سے کہا تھا "آپ اپنے طالب علموں کو کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ کھانا پکانا اور صفائی کا کام بھی سکھائیں۔ تب ہی آپ کا اسکول مثالی اسکول بن سکے گا۔" طالب علموں کو انھوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ "اگر تم اپنے بھنگی خود بن جاؤ تو تم اپنے ارد گرد کی صفائی رکھ سکو گے۔ دکٹوریہ کراس پانے کے لئے جس ہمت اور بہادری کی ضرورت ہے ایک تجربہ کار بھنگی بننے کے لئے اس سے کم ہمت نہیں چاہئے۔"

آشرم کے آس پاس جو دیہاتی تھے وہ فضلے پر مٹی نہیں ڈالتے تھے اور کہتے تھے "یہ کام تو بھنگیوں کا ہے۔ فضلے کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔" گاؤں میں صفائی کے کام کا معائنہ گاندھی جی اپنے آپ کرتے تھے۔ ان کو صفائی سکھانے کے لئے گاندھی جی مہینوں تک خود بالٹی اور جھاڑو لے کر گاؤں گاؤں گئے۔ ان کے دوست اور مہمان

بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ جاتے تھے۔ وہ بالٹیوں میں کوڑا غلاظت بھر کر لاتے اور اس کو گڑھوں میں دبا دیتے تھے۔ گاندھی جی کے نزدیک فضلے کو ٹھکانے لگانا بھی ایک سائنس تھی۔

آشرم میں صفائی کا تمام کام گاندھی جی کی رہنمائی میں وہاں کے رہنے والے کرتے تھے۔ آشرم میں مختلف نسلوں، مذہبوں اور ذاتوں کے لوگ رہا کرتے تھے۔ آشرم میں گرد و غبار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ گڑھوں میں دبا دیا جاتا تھا۔ سبزیوں کے چھلکے اور کھانے کا جھوٹن کھاد بنانے کے لئے ایک الگ گڑھے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ فضلہ بھی گڑھوں میں دبا دیا جاتا تھا اور پھر اس کی کھاد کام میں لائی جاتی تھی۔ استعمال شدہ بے کار پانی سے باغ کی سنچائی کی جاتی تھی۔ آشرم میں اگرچہ پکی نالیاں نہیں تھیں پھر بھی وہاں مکھیوں اور بدبو کا نام تک نہیں تھا۔ گاندھی جی اور ان کے ساتھی باری باری صفائی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے آشرم میں بالٹیوں والے پاخانے اور دو گڑھوں والے پاخانے بنوائے۔ وہ ہر آنے والے مہمان کو اپنی یہ جدت فخر سے دکھاتے تھے۔ امیر غریب، لیڈر، مزدور، ہندوستانی اور غیر ہندوستانی سب ہی کو ان پاخانوں میں جانا ہوتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ آشرم میں رہنے والے پرانے خیال کے ساتھیوں اور عورتوں کے ذہنوں سے کوڑا اور غلاظت اٹھانے میں جو کراہت تھی وہ دور ہو گئی۔

گاندھی جی کو صفائی کا کوئی معمولی سا کام کرنے کا موقع ملتا تھا تو انھیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کی صفائی پسندی کی جانچ ان کے پاخانوں کی حالت سے کیا

کرتے تھے۔ ۷۷ سال کی عمر میں انھوں نے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ "جو پاخانہ میرے استعمال میں رہتا ہے وہ اتنا صاف ہے کہ اس میں داغ، دھبے یا بدبو کا نام ونشان نہیں ہیں اس کی صفائی خود کرتا ہوں"۔ انھوں نے کئی موقعوں پر اپنا تعارف ایک بھنگی کی حیثیت سے کرایا وہ کہتے تھے کہ اگر وہ ایک بھنگی کی حیثیت سے مرے تو انھیں بڑا سکون ملے گا۔ انھوں نے پرانے خیال کے ہندوؤں سے کہا تھا کہ اچھوتوں کے ساتھ مجھے بھی سماج سے نکال دو۔

وہ بھنگیوں کی بستیوں میں جاتے تھے اور بھنگی اُن سے اپنی مصیبت کی داستان بیان کرتے تھے۔ گاندھی جی ان کو اطمینان دلاتے تھے کہ اپنا کام کرنا ذلت کی بات نہیں ہے۔ انھیں یہ مشورہ بھی دیتے کہ وہ شراب پینا اور مردہ جانوروں کا گوشت کھانا چھوڑ دیں۔ گاندھی جی نے بھنگیوں کی ہڑتال کی حمایت کبھی نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھنگی کو ایک دن کے لیے بھی اپنا کام نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اخبار" ہریجن" میں انھوں نے نمونے کے ایک بھنگی کی خصوصیات کی وضاحت اس طرح کی ہے" اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اچھے قسم کے پاخانے کس طرح بنتے ہیں اور ان کی صفائی کا مناسب طریقہ کیا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کس طرح بدبو دور کی جاتی ہے اور متعدی جراثیم کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسے اس کا بھی علم ہونا چاہیے کہ پیشاب پاخانے سے کھاد کس طرح بنتی ہے"۔ اس پیشے کو محض بھنگیوں تک محدود کرنے کی بجائے گاندھی جی اسے ایک لازمی سماجی کام (سوشل ورک) کی شکل

دینا چاہتے تھے۔

کھادی یاترا کے دوران ایک جگہ جس جلسے میں گاندھی جی کو تقریر کرنا تھی وہاں بھنگیوں کو آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ گاندھی جی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے جلسہ کا انتظام کرنے والوں سے کہا "آپ اپنا چندہ اور سپاسنامہ اپنے پاس رکھیے میں تو اچھوتوں کے پاس جا رہا ہوں۔ جو لوگ آنا چاہیں وہ وہیں آجائیں"۔

اپنے انتقال سے دو سال قبل گاندھی جی کچھ دنوں بمبئی اور دہلی میں بھنگیوں کی بستی میں رہے۔ اُن کے ساتھ ہی ٹھیرنا اور ان کے ساتھ کھانے پینے میں بھی شریک ہونا چاہتے تھے لیکن اب وہ خاصے بوڑھے ہو گئے تھے اور اس قسم کے تجربے نہیں کر سکتے تھے اس کے علاوہ جہاں تماہونے کی وجہ سے انھیں کچھ رعائتیں زبردستی دے دی گئی تھیں۔

گاندھی جی ایک بار وائسرائے سے ملنے شملہ گئے وہاں انھوں نے اپنے ایک ساتھی کو بھنگیوں کی بستی دیکھنے بھیجا۔ انھیں جب یہ بتایا گیا کہ ان کے کوارٹر تو جانوروں کے رہنے کے لیے بھی مناسب نہیں ہیں تو انھوں نے بڑے دکھ سے کہا "آج ہم نے بھنگیوں کو جانوروں سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔ انھیں چند ٹکوں کی خاطر اپنے انسانی مقام سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے کسی بھنگی کو پاخانے کی دیوار کے سائے میں گندگی اور غلاظت کے بیچ اپنا کھانا کھاتے دیکھیے۔ اس منظر کو دیکھ کر کس کا دل نہ تڑپ اٹھے گا۔ کسی بھنگی کو فضلے کا ٹوکرا سر پہ لے جاتے دیکھ کر گاندھی جی کو بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ مناسب اوزاروں سے صفائی کا کام اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک صفائی کا کام ایک فن

تھا اور وہ اپنے آپ کو گندہ کئے بغیر یہ کام بخوبی کرتے تھے ۔

ایک بار ایک غیر ملکی نے گاندھی جی سے پوچھا "اگر آپ کو ایک دن کے لئے ہندستان کا وائسرائے بنا دیا جائے تو آپ کیا کریں گے ۔ ؟"

گاندھی جی نے کہا "میں وائسرائے ہاؤس کے پاس بھنگیوں کے جو گندے ٹھکانے ہیں، انھیں صاف کروں گا۔"

"فرض کیجئے اس مدت میں ایک روز کا اور اضافہ کر دیا جائے تب ....."

"میں دوسرے دن بھی یہی کام کروں گا۔"

موچی

ترپیٹھ سال کی عمر میں گاندھی جی، ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ یرودا جیل میں قید ہوئے۔ ولبھ بھائی کو ایک جوڑا چپل کی ضرورت تھی مگر اس سال جیل میں کوئی اچھا موچی نہیں تھا۔ گاندھی جی نے ان سے کہا "اگر مجھے اچھا چمڑا مل جائے تو میں آپ کے لئے چپل تیار کر سکتا ہوں۔ دیکھوں تو سہی کہ جو فن میں نے پہلے کبھی سیکھا تھا وہ مجھے یاد بھی ہے یا نہیں۔ میں کبھی ایک اچھا موچی تھا۔ میرے کام کا نمونہ سودپور کے کھادی پرتشٹھان میوزیم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے چپل کا وہ جوڑا '.......' کے لئے بھیجا تھا۔ اور اس نے کہا تھا کہ "ان چپلوں کو میں اپنے سر کی زینت تو بنا سکتا ہوں، مگر پاؤں میں نہیں پہن سکتا۔" ٹالسٹائی فارم میں بھی میں نے بہت سی چپلیں بنائی تھیں۔"

۱۹۱۱ء میں گاندھی جی نے اپنے بھتیجے کو لکھا تھا کہ "میں آج کل زیادہ تر چپلیں بنانے میں مصروف رہتا ہوں۔ میں یہ کام پسند بھی کرتا ہوں اور اسے ضروری بھی سمجھتا ہوں میں اب تک پندرہ جوڑے چپلیں تیار کر چکا ہوں۔ جب تمھیں نئی چپل کی ضرورت ہو تو تم مجھے اپنا ناپ ضرور بھیجنا۔"

یہ فن انھوں نے جنوبی افریقہ میں اپنے جرمن دوست کیلن باخ سے سیکھا تھا۔ گاندھی جی نے بہت سے لوگوں کو جوتا بنانا سکھایا وہ لوگ جوتا بنانے میں اپنے استاد سے بھی بازی لے گئے۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے جوتے بازار میں فروخت کئے جاتے تھے۔ اس زمانے میں گاندھی جی نے پتلون کے ساتھ چپل پہننے کا فیشن بھی چلایا۔ گرم ممالک میں چپلیں بند جوتوں کی بہ نسبت زیادہ آرام دہ ثابت ہوئیں۔ سردیوں میں بھی انھیں بڑی آسانی سے موزوں پر پہنا جا سکتا ہے۔

ایک بار سردار پٹیل، جواہر لال اور دوسرے لوگ گاندھی جی سے مشورہ لینے کے لئے سیوا گرام گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی تربیت پانے والے ایک گروپ کو جوتا بنانا سکھا رہے ہیں۔ "تسمے یہاں ہوں، ٹانکے اس طرح اور تلے پر جہاں دباؤ زیادہ پڑتا ہے وہاں چمڑے کے ٹکڑے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے لگائے جائیں۔" گاندھی جی ان کی خامیاں درست کر رہے تھے۔ ایک لیڈر نے شکایت کی کہ "یہ لوگ تو ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔" گاندھی جی نے فوراً جواب دیا "جو کچھ یہ سیکھ رہے ہیں اس پر رشک نہ کیجئے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی سیکھ لیجئے کہ ایک اچھی چپل کیسے بنتی ہے۔"

ایک دن گاندھی جی اور ان کے کچھ ساتھیوں نے دیکھا کہ گاؤں کے چمار مرے ہوئے بیل کی کھال اتار رہے ہیں۔ چماروں نے ایک معمولی دیہاتی چاقو سے بغیر اُسے نقصان پہنچائے جانور کے جسم سے کھال اُتار لی۔ ان کی اس مہارت سے گاندھی جی بہت متاثر ہوئے انھیں بتایا گیا کہ گاؤں کے چمار یہ کام جس مہارت سے کر لیتے ہیں اتنی مہارت سے ڈاکٹر

یہ کام نہیں کر سکتے ۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ انسانی جسم کی چیر پھاڑ کرنے والا میڈیکل کا طالب علم بھی وہی کام کرتا ہے جو چمار کرتا ہے ۔ لیکن ہمارے ہاں ڈاکٹر کے کام کو تو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے چمار یا بھنگی کے کام کو حقیر اور ان لوگوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے ۔

گاندھی جی جوتا بنانے کا کام ہی سیکھ کر مطمئن نہیں ہوئے ، وہ چمڑا بنانے کے کام میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ انھیں ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا ۔ دنیا میں بے شمار لوگ چمڑے کے جوتے پہنتے ہیں اور یہ چمڑا زیادہ تر تندرست جانوروں ۔۔ گائے ، بیل ، بھیڑ اور بکریوں کو مار کر تیار کیا جاتا ہے ۔ گاندھی جی اہنسا پر یقین رکھتے تھے ۔ ایسا شخص جو اپنی مرتی ہوئی بیوی اور بیمار بچے کو گائے کی یخنی اور انڈا دینے پر تیار نہ ہو وہ چمک دار جوتے پہننے کے لئے جانوروں کو مارنے پر کبھی رضا مند نہیں ہو سکتا ۔ لیکن بہر حال انھیں چمڑے کی ضرورت تھی ۔

انھوں نے ایسے جانوروں کا چمڑا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو قدرتی موت مرے ہوں ۔ ایسے چمڑے سے جو چپلیں بنتی تھیں وہ "اہنسک" چپلوں کے نام سے مشہور ہوئیں ۔ مردہ جانوروں کی بہ نسبت مارے گئے جانوروں کی کھال اتارنا زیادہ آسان تھا اس لئے چمار 'اہنسک' چمڑا فراہم نہیں کرتے تھے ۔ آخر گاندھی جی نے کھال اتارنے کا فن بھی سیکھا ۔

انھوں نے پتہ لگایا کہ ہر سال نو کروڑ روپے کا خام چمڑا ہندوستان سے باہر جاتا

ہے ۔ اور سائنٹفک طریقے پر صاف ہونے کے بعد اسی چمڑے سے تیار ہو کر کروڑوں روپے کی چیزیں ہندوستان میں درآمد ہوتی ہیں ۔ اس طرح صرف مالی نقصان ہی نہیں ہوتا بلکہ چمڑا بنانے اور چمڑے کی اچھی چیزیں تیار کرنے میں کاریگروں کی سوجھ بوجھ کو پھلنے پھولنے کا موقع بھی نہیں مل پاتا ۔ سوت کاتنے والوں اور جلاہوں کی طرح سینکڑوں چماروں اور موچیوں کو بھی ان کی روزی سے محروم کر دیا گیا تھا ۔
گاندھی جی حیران تھے کہ چمڑے کا کاروبار کرنا ایک ذلیل پیشہ کیسے بن گیا ؟ پرانے وقتوں میں تو ایسا نہیں تھا ۔ آج ہزاروں چمار یہ کام کرتے ہیں اور انھیں نسلوں سے اچھوت سمجھا جاتا ہے ۔ اونچے طبقے کے لوگ انھیں ذلیل سمجھتے ہیں اور وہ فن، تعلیم، صفائی اور وقار سے محروم زندگی بسر کرتے ہیں ۔ چمار، بھنگی اور موچی انسانی بھلائی اور سماجی خدمت کا کام کرتے ہیں لیکن ذات پات کی تفریق قوم کے اس حصے کو تکلیف دہ زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہے ۔ دوسرے ملکوں میں اگر کوئی آدمی چمار یا موچی کا پیشہ اختیار کرے تو وہ محض اس وجہ سے غریب، جاہل یا اچھوت نہیں بن جاتا کہ وہ چمار ہے ۔

اس دیسی صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے گاندھی جی نے عوام سے اپیلیں کیں اور سائنس دانوں سے مدد چاہی کہ وہ گاؤں میں چمڑا سازی کے فن کو جو بہت جلد ختم ہو رہا ہے اُسے دوبارہ زندہ کریں ۔ گاندھی جی کا خیال تھا چمڑا سازی کے سُدھرے ہوئے طریقے سے مردار گوشت کا کھانا بھی چھوٹ جائے گا ۔ کہیں کہیں تو یہ حال تھا کہ

جب کسی چمار کے گھر کوئی مُردہ گائے لائی جاتی تو سارا خاندان خوش ہو جاتا کیوں کر اس دن تو مُردہ جانور کے گوشت کی دعوت ہو جاتی تھی۔ بچے خوشی کے مارے ناچنے لگتے اور جیسے ہی جانور کی کھال اتاری جاتی وہ اس کی ہڈیاں اور گوشت کے ٹکڑے لے کر ایک دوسرے پر اچھالتے۔ گاندھی جی کو یہ منظر بہت گھناؤنا لگتا تھا۔

انھوں نے ہریجن چماروں سے کہا "آپ لوگ اگر مُردار گوشت کھانا نہیں چھوڑیں گے تو ممکن ہے میں تو آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں لیکن پرانے خیال کے لوگ آپ سے ملنے جلنے میں پرہیز کریں گے۔ یوں بھی یہ ایک گھناؤنی عادت ہے۔" چماروں نے کہا "ہم مردہ جانوروں کو اٹھاتے ہیں، ان کی کھال اتارتے ہیں اس لئے آپ ہم سے یہ امید رکھئے کہ ہم مُردار گوشت کھانا چھوڑ دیں گے۔" گاندھی جی نے کہا "کیوں نہیں چھوڑ سکتے؟ میں آپ کے سامنے کھال اتاروں گا مگر کسی دن آپ مجھے مُردار گوشت کھاتے نہ پائیں گے۔ میں اپنے تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ کام بالکل صاف ستھرے اور صحت مند طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔"

گاندھی جی نے سابرمتی اور وردھا آشرم میں چمڑا سازی کا ایک شعبہ کھولا۔ اس کی ابتدا چھوٹے پیمانے پر ہوئی۔ مگر بعد میں چمڑا رکھنے کے لئے پکی عمارت بن گئی۔ گاندھی جی نے عمارت کے لئے پچاس ہزار روپے جمع کئے تھے۔ یہاں ماہر چماروں کی نگرانی میں آشرم کے لڑکے چمڑے کا کام سیکھتے۔ اور چمڑے کا جو سامان تیار ہوتا وہ بازار میں بیچ دیا جاتا تھا۔ یہ تمام سامان صرف مردہ جانوروں کے چمڑے سے تیار ہوتا۔

گاندھی جی کلکتے کے قومی چمڑا سازی کے کارخانے کو دیکھنے گئے۔ انھوں نے وہاں کروم چمڑا بنانے کا طریقہ بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ کس طرح نمک لگی گائے کی کھال پر چونے کا پانی لگاکر بال صاف کیے جاتے ہیں اور کس طرح چمڑے کو رنگا جاتا ہے۔

چمڑے کے کام کے دیسی طریقے کو بہتر بنانے کے لیے ٹیگور کے شانتی نکیتن میں جو تحقیقی کام ہو رہا تھا اس سے بھی گاندھی جی باخبر تھے۔ گاندھی جی چمڑا سازی کے پرانے دیسی طریقے کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے نہ وہ چمڑا بنانے اور دوسری صنعتوں کو گاؤں سے ہٹاکر شہروں میں لے جانا پسند کرتے تھے۔ اس کا مطلب تو گاؤں والوں کی پوری پوری تباہی تھا۔ اس طرح انھیں اپنے ہاتھوں اور دماغ کے ماہرانہ استعمال کا جو تھوڑا بہت موقع حاصل تھا وہ بھی ختم ہو جاتا۔ مردہ جانور کو گاؤں کے باہر اٹھا کر لے جانے کا وہ مناسب اور بہتر طریقہ تلاش کرنا چاہتے تھے۔ گاؤں کا چمار اُسے گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے اس طرح کھال خراب ہوتی ہے اور اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ گاؤں کے چمار یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہڈیوں کا کیا کیا جائے۔ وہ انھیں بے کار سمجھ کر کتّوں کے آگے پھینک دیتے تھے اس سے اُن کا نقصان ہوتا تھا۔ دوسرے ملکوں میں ہڈیوں سے دستے اور بٹن وغیرہ بنتے ہیں اور پھر انھیں ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہڈیوں کے چورے کی کھاد بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔

گاندھی جی چماروں کی جھونپڑیوں میں گئے۔ اُن سے گھُلے ملے اور ان سے باتیں کیں۔ چماروں کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ اُنھیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔ گاندھی جی

ان کی ترقی کے لئے بہت کچھ کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ چماروں کی بستی میں جانے پر چماروں نے ان سے پینے کے پانی کی دشواری بتائی۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ انھیں عام کنووں سے پانی بھرنے یا کسی مندر میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ بھی بتایا کہ کس طرح لوگ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں اور کس طرح انھیں گاؤں یا شہر سے باہر رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی یہ سن کر بہت دکھی اور شرمندہ ہوئے۔ گاندھی جی چماروں کو خیرات دینا بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں ٹیگور کی طرح ان کا بھی کہنا تھا کہ ہندوستان کے لئے وہ دن بہت ہی بُرا تھا جب سے جسمانی محنت کو حقیر سمجھا جانے لگا اور ٹیگور کی طرح اُن کی بھی پیشین گوئی تھی کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب اپنے بھائیوں کو انسانی حقوق سے محروم رکھنے والوں کو اپنی بے انصافیوں اور ظلموں کا جواب دینا پڑے گا۔

گاندھی جی کو کچھ ایسے مخلص لوگوں کی ضرورت تھی جو چماروں کو مناسب اُجرت دلائیں، ان کی تعلیم اور طبی امداد کا انتظام کریں، ان کے لئے شبینہ مدرسے قائم کریں اور ان کے بچوں کو پکنک اور تعلیمی سیر کے لئے لے جائیں۔ انھوں نے خود چماروں کی بستیوں میں شبینہ مدرسے کھولے اور ہریجنوں کی خدمت کے کام پر توجہ دی۔

چماروں نے بھی ان کی ان باتوں کا اثر لیا۔ کچھ نے وعدہ کیا کہ وہ صرف مرے ہوئے جانوروں کے چمڑے کی چیزیں بنائیں گے، شراب اور مردار گوشت چھوڑ دیں گے ایک مرتبہ گاندھی جی پھٹی ہوئی چپل پہن کر چماروں کے ایک جلسے میں چلے گئے۔ وہ سفر

کی حالت میں تھے اور ان کے پاس چپلوں کا دوسرا جوڑا نہیں تھا۔ چماروں نے دیکھ لیا اور دو چماروں نے مل کر "اہنسک چپل" تیار کی اور یہ چپل اُن کی خدمت میں پیش کی ۔

جنوبی افریقہ میں جنرل اسمٹز کو جس نے انھیں جیل خانے میں قید کیا گاندھی جی نے ایک جوڑا چپل کا بنا کر دیا۔ گاندھی جی کی سترویں سالگرہ پر انھوں نے لکھا کہ "گاندھی جی نے جیل میں رہ کر مجھے چپلوں کا تحفہ دیا تھا میں نے کئی گرمیوں تک انھیں پہنا۔ اگرچہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اتنی بڑی ہستی کے جوتوں میں بھی کھڑا ہونے کے لائق نہیں ہوں۔"

ملازم

گاندھی جی آشرم میں کئی ایسے کام بھی کرتے تھے جو عموماً ملازم کرتے ہیں۔ جس زمانے میں ایک وکیل کی حیثیت سے وہ ہزاروں روپے کما رہے تھے اس وقت بھی وہ ہر روز صبح بڑی باقاعدگی سے گیہوں پیستے تھے۔ کستوربا اور ان کے لڑکے بھی گیہوں پیسنے میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس طرح انھیں گھر پر بغیر خمیر کی اور بغیر چھنے آٹے کی روٹیاں پکانے کے لیے تازہ باریک یا موٹا آٹا مل جاتا تھا۔ سابرمتی آشرم میں بھی گاندھی جی نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ وہ چکی کی مرمت کرنے میں گھنٹوں لگے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کارکن نے انھیں بتایا کہ آشرم میں آٹا کم پڑ گیا ہے تو گاندھی جی فوراً گیہوں پیسنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ گیہوں کی پسائی سے پہلے اس کی صفائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اکثر مہمانوں نے اس عظیم شخص کو دھوتی پہنے گیہوں پیسنے میں مصروف دیکھا ہے غیروں کے سامنے انھیں محنت کا کام کرنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کالج کا کوئی طالب علم گاندھی جی سے ملنے آیا اسے اپنی انگریزی پر بڑا ناز تھا۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد اس نے کہا "باپو، اگر میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں تو مجھے ضرور بتایئے۔"

اسے توقع تھی کہ وہ اُسے کوئی علمی کام دیں گے۔ گاندھی جی نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور بولے "اچھا، اگر تمھارے پاس کچھ وقت ہو تو اس تھالی کے گیہوں بین دو۔" بے چارہ طالب علم شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ گیہوں بینتے بینتے تھک گیا اور پریشان ہو کر رخصت چاہی اور واپس چلا گیا۔

گاندھی جی نے کئی برس تک آشرم کے اسٹور کا کام سنبھالنے میں بھی مدد کی۔ وہ صبح کی پوجا پاٹھ کے بعد باورچی خانے میں سبزیاں کاٹتے تھے۔ اگر باورچی خانے میں کہیں کوڑا یا جالا انھیں نظر آتا تھا تو گاندھی جی اور ان کے ساتھی اسے صاف کر دیتے تھے۔ انھیں سبزیوں، پھلوں اور اناج کی غذائی قدر اور قیمت کا بخوبی علم تھا۔ ایک بار ایک آشرم واسی نے بغیر دھوئے آلو کاٹ دیئے۔ گاندھی جی نے اسے لیمو اور آلو کو کاٹنے سے پہلے دھو لینے کی وجہ بتائی۔ آشرم میں رہنے والے ایک دوسرے شخص کو کچھ چتی دار کیلے دیئے گئے تو اسے بڑا دکھ ہوا۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں نے یہ کیلے تمھیں خاص طور سے دیے ہیں اس لئے کہ یہ زود ہضم ہوتے ہیں۔ گاندھی جی اکثر آشرم میں رہنے والے ایسے لوگوں کو بھی کھانا دیا کرتے تھے جنھیں اُبلے ہوئے بدمزہ کھانے سے چڑھ تھی۔ جنوبی افریقہ کی جیل میں دن میں دو بار وہ سیکڑوں کے آگے کھانا لگاتے تھے۔

آشرم کا ایک قاعدہ یہ تھا کہ سب لوگ اپنے برتن خود صاف کریں۔ باورچی خانے کے برتن باری باری سے کچھ لوگ مل کر دھویا کرتے تھے۔ ایک دن گاندھی جی نے بڑے اور بھاری پتیلیوں کی صفائی کا کام اپنے ذمہ لیا۔ ان پتیلیوں پر کالک کی تہیں جمی ہوئی تھیں

ہاتھوں میں کالک تھوپے گاندھی جی پتیلیوں کو رگڑ رگڑ کر مانجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک وہاں کستوربا آپہنچیں۔ انھوں نے پتیلا پکڑ لیا اور بولیں "یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے۔ اسے اور بہت سے لوگ بھی کر سکتے ہیں۔" گاندھی جی نے سوچا کہ اس وقت بات مان لینا ہی بہتر ہے۔ اور برتن ان کے سپرد کر کے الگ ہو گئے۔ دھات کے برتن جب تک خوب چمکنے نہ لگیں اس وقت تک گاندھی جی کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جیل میں اپنے ایک مددگار کے کام سے خفا ہو گئے اور اُسے لوہے کے برتنوں کو چاندی کی طرح چمکا کر دکھایا۔

جب آشرم کی تعمیر ہو رہی تھی تو اس وقت کچھ مہمانوں کو خیموں میں سونا پڑتا تھا۔ ایک نئے آدمی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اپنا بستر کہاں رکھے۔ اس لئے اس نے بستر لپیٹ کر رکھ دیا اور یہ معلوم کرنے نکلا کہ اسے بستر کہاں رکھنا ہے۔ واپسی پر اس نے دیکھا کہ گاندھی جی اس کا بستر اپنے کندھوں پر لادے چلے آرہے ہیں۔

آشرم کے احاطے سے باہر ایک کنویں سے روز پانی لانا بھی ان کے کاموں میں داخل تھا۔ ایک روز ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور وہ آٹا پیسنے کے کام میں بھی شریک ہو چکے تھے۔ ان کے ایک ساتھی نے گاندھی جی کو مزید تکان سے بچانے کے لئے آشرم کے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے سب چھوٹے بڑے برتن پانی سے بھر ڈالے۔ گاندھی جی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ بچوں کے نہانے کا ٹب اٹھا کر پانی بھرنے چلے اور پانی بھر کر اسے اپنے سر پر اٹھا کر لے آئے۔ بے چارہ ساتھی اپنی اس نادانی پر

بہت پشیمان ہوا۔ بہت دنوں بعد جب زیادہ محنت کرنا جسمانی طور پر ناممکن ہوگیا اس وقت تک گاندھی جی کو اس وجہ سے کہ وہ جہاتما ہیں یا بوڑھے ہو چکے ہیں اپنے معمول کو چھوڑنا پسند نہیں تھا۔ ہر طرح کا کام کرنے کی ان میں غیر معمولی طاقت اور قوت ارادی موجود تھی۔ وہ کبھی نہیں تھکتے تھے۔ بوائر کی جنگ کے زمانے میں وہ اسٹریچر اٹھائے اٹھائے ایک دن میں پچیس میل تک چلے تھے۔ وہ زیادہ تر پیدل چلا کرتے تھے۔ ٹالسٹائی فارم سے وہ اکثر ایک دن میں بیالیس میل تک پیدل چلے ہیں۔ گھر میں تیار کیا ہوا ناشتہ لے کر صبح ۲ بجے نکل جاتے اور خریداری کر کے شام کو واپس آجاتے۔ ان کے دوسرے دوست اور ساتھی بھی بخوشی ان کی پیروی کرتے۔

ایک بار کسی تالاب کی بھرائی کا کام ہو رہا تھا۔ گاندھی جی کے ساتھی اس کام میں مشغول تھے۔ ایک صبح کام سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ لوگ بیلچے، کدال اور ٹوکریاں لئے ہوئے واپس ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی نے بہت سی پلیٹوں میں ان کے لئے پھلوں کا ناشتہ تیار کر رکھا ہے۔ ایک ساتھی نے پوچھا "آپ نے ہم لوگوں کے لئے یہ زحمت کیوں اٹھائی؟ کیا یہ مناسب ہے کہ آپ ہماری خدمت کریں؟" گاندھی جی نے مسکرا کر جواب دیا "کیوں نہیں۔ میں جانتا تھا کہ تم لوگ تھکے ماندے واپس آؤ گے پھر ناشتہ تیار کرنے کے لئے میرے پاس خالی وقت بھی تھا۔"

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے مشہور و معروف لیڈر ہونے کے ناطے گاندھی جی ہندوستانی نوآبادکاروں کی مانگوں کو برطانوی حکومت کے سامنے رکھنے کے لئے لندن

گئے۔ وہاں ہندوستانی طالب علموں نے انھیں نباتاتی دعوت پر مدعو کیا اور فیصلہ کیا کہ دعوت کا کھانا وہ خود پکائیں گے۔ دُبلا پتلا آدمی بھی اُن میں شریک ہوگیا۔ اور برتن صاف کرنے، سبزیاں دھونے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ان کی مدد کرتا رہا۔ بہت دیر کے بعد جب اُن طالب علموں کا لیڈر وہاں آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ شخص کوئی اور نہیں شام کو آنے والا ان کا معزز مہمان ہے۔

گاندھی جی دوسروں سے کام لینے میں بہت سخت تھے لیکن اُن سے اپنا کام کرانا انھیں پسند نہیں تھا۔ ایک سیاسی کانفرنس کے خاتمے پر لوگوں نے اُنھیں دیکھا کہ وہ سونے سے پہلے دس بجے رات کو کمرے میں جھاڑو دے رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کا ایک چیلا جھٹ ان کی مدد کو پہنچا۔ گاندھی جی نے مسکرا کر جھاڑو اسے دے دی۔ گاندھی جی جب گاؤں گاؤں پھر رہے ہوتے اس زمانے میں اگر رات کو لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا تو وہ اپنے تھکے ہوئے ساتھی کو جگانے کی بجائے چاندنی کی روشنی میں بیٹھ کر خط لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ نواکھالی کی یاترا کے دوران انھوں نے اپنے صرف دو ساتھیوں کو اپنے کیمپ میں ٹھہرنے کی اجازت دی۔ ان دونوں کو 'کھاکھرا' پکانا نہیں آتا تھا۔ گاندھی جی نے باورچی خانے میں جا کر ماہر باورچیوں کی طرح 'کھاکھرا' پکانے کا طریقہ ان کو سمجھایا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھتر برس کی تھی۔

گاندھی جی کو بچوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ اپنے بچوں کی پیدائش کے دو ماہ بعد انھوں نے کبھی کسی آیا کے پاس ان کو نہیں رہنے دیا۔ والدین کی محبت اور دیکھ بھال کو وہ بچے

کی نشوونما کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ماں کی طرح بچوں کی دیکھ بھال کرتے تھے، دودھ پلاتے اور بہلاتے تھے۔ جنوبی افریقہ کے جیل سے رہائی کے بعد گاندھی جی گھر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ اُن کے دوست کی بیوی مسز پولک بہت کمزور اور دُبلی ہوگئی ہیں۔ وہ اپنے بچے کا دودھ چھڑانا چاہتی تھیں۔ بچہ انھیں چین نہیں لینے دیتا تھا اور رو رو کر انھیں جگائے رکھتا تھا۔ اسی رات سے انھوں نے بچے کی دیکھ بھال کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ دن بھر سخت محنت کرنے، جلسوں میں تقریریں کرنے اور چار میل کی مسافت طے کرنے کے بعد گاندھی جی بعض اوقات ایک بجے رات کو گھر پہنچتے تھے۔ بچے کو ماں کے پاس سے اٹھاتے اور اپنے بستر پر لٹا لیتے تھے۔ وہ بچے کے لئے اپنے قریب ہی پانی سے بھرا جگ رکھتے تھے کہ اگر بچے کو پیاس لگے تو اُسے پلادیں۔ لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ بچہ بالکل نہ روتا اور مزے سے سوتا رہتا۔ آخر پندرہ دن کے بعد دودھ چھڑانے کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔

گاندھی جی اپنے سے بڑوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ گوکھلے جب گاندھی جی کے ساتھ ٹھیرے ہوئے تھے تو گاندھی جی نے ان کے پٹکے پر استری کی، ان کا بستر ٹھیک کیا، ان کے لئے کھانا لگاتے اور ان کے پیر دبانے کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔ گوکھلے کے منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانتے تھے۔ مہاتما بننے سے پہلے وہ جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے اور کانگریس کے ایک اجلاس میں شریک ہوئے۔ وہاں انھوں نے گندے پاخانے صاف کئے اور پھر ایک کانگریسی لیڈر سے دریافت کیا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا

ہوں ؟" لیڈر نے کہا میرے پاس بہت سے خط جمع ہو گئے ہیں اُن کا جواب نہیں دیا جا سکا ہے۔ میرے پاس کوئی کلرک بھی نہیں ہے جس کے سپرد یہ کام کروں۔ کیا تم یہ کام کرنا پسند کرو گے ؟" گاندھی جی بولے "ضرور، میں ایسا کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہوں جو میرے بس سے باہر نہ ہو۔" انھوں نے بہت تھوڑے سے وقت میں کام ختم کر لیا اور خاص خدمت گار کی طرح ان کی قمیض میں بٹن ٹانکے اور اُن کے بہت سے دوسرے کام انجام دیے۔

جب کبھی آشرم میں کسی تجربے کار مددگار کی ضرورت ہوتی تھی تو گاندھی جی چھوت چھات کے بندھنوں کو توڑنے کے لئے کسی ہریجن کو ملازم رکھنے پر زور دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہم کو نوکروں کے ساتھ زرخرید غلاموں کا سا سلوک نہیں کرنا چاہیئے بلکہ انھیں اپنا بھائی سمجھنا چاہیئے۔ اس میں کچھ دشواریاں، کچھ نقصانات اور کچھ تجربے ہوں گے لیکن یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔"

انھیں کبھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ کسی شخص کو اپنا نوکر کس طرح بنائیں۔ ہاں ایک بار ہندوستانی جیل میں انھوں نے جیل کے ساتھیوں کی خدمت کا لطف اٹھایا۔ ایک آدمی ان کے لیے پھل صاف کرتا، دوسرا بکریوں کا دودھ دوہتا۔ تیسرا ان کے ذاتی خدمت گار کی طرح کام کرتا اور چوتھا ان کے پاخانے کی صفائی کرتا تھا۔ ایک برہمن ان کے برتن دھوتا اور یورپ کے رہنے والے دو آدمی روزانہ ان کا پلنگ باہر نکالتے تھے۔

گاندھی جی نے دیکھا کہ انگلستان کے اعلیٰ خاندانوں میں گھریلو ملازموں کو خاندان کا

ہی کا فرد کہا جاتا ہے تو انہیں بے حد خوشی ہوئی ۔ اسی طرح کی خوشی انھیں ایک بار اور ہوئی تھی جب ان کے انگریز میزبان نے اپنے ملازموں سے ان کا تعارف نوکروں کی حیثیت سے نہیں بلکہ گھر کے لوگوں کی حیثیت سے کرایا ۔

ایک مرتبہ کافی لمبے عرصہ قیام کے بعد گاندھی جی نے اپنے ہندوستانی میزبان کے نوکروں سے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا " میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں آپ کا کتنا شکرگزار ہوں ۔ میں نے زندگی بھر کسی کو اپنا نوکر نہیں کہا ۔ ہمیشہ اُسے اپنا بھائی یا بہن مانا ہے ۔ میں آپ لوگوں کو بھی اپنا بھائی سمجھتا رہا ہوں ۔ آپ نے میری جو خدمت کی ہے اس کا بدلہ دینا میرے بس میں نہیں ہے ۔ لیکن خدا اس کا اجر ضرور دے گا "

باورچی

مہادیو ڈیسائی نے کسی موقع پر گاندھی جی سے پوچھا "باپوجی! فینکس آشرم قائم کرنے سے پہلے کیا آپ کے پاس کوئی باورچی تھا؟" گاندھی جی نے کہا "نہیں۔ میں نے بہت پہلے اس سے چھٹکارا پالیا تھا۔ ہمارے پاس ایک بہت اچھا باورچی تھا لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ بغیر مسالے کا کھانا نہیں پکا سکتا تو میں نے اسے فوراً رخصت کر دیا اور پھر کبھی کوئی باورچی نہیں رکھا۔" یہ اس وقت کی بات ہے جب گاندھی جی تقریباً پینتیس برس کے تھے۔

اٹھارہ برس کی عمر میں جب وہ انگلستان میں تھے تو انھوں نے پہلے پہل کھانا پکانے کی کوشش کی۔ وہ بڑے کٹر سبزی خور تھے۔ انگلستان میں اس وقت سبزی خوری کا رواج نسبتاً نیا تھا۔ وہاں انھیں عام طور سے ڈبل روٹی، مکھن، جام اور بغیر مسالے کی ابلی ہوئی سبزیاں ملتی تھیں۔ گاندھی جی کو یہ ساری چیزیں بے مزہ لگتی تھیں کیوں کہ وہ اپنی والدہ کے پکائے ہوئے مسالے دار لذیذ ہندوستانی کھانوں کے عادی تھے۔

کئی مہینے تک نباتاتی ہوٹلوں میں کھانا کھانے کے بعد گاندھی جی نے کفایت شعاری

کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اسٹو پر اپنا ناشتہ اور کھانا خود تیار کرنے لگے۔ وہ بیس منٹ میں کھانا پکا لیتے تھے، اور اس کھانے پر کل بارہ آنے کی لاگت آتی تھی۔

جب گاندھی جی نے سالٹ کی کتاب "پلی فور ویجیٹیرین ازم" (PLEA FOR VEGETARIANISM) پڑھی اور لندن کے سبزی خوروں کی انجمن سے ان کا تعلق ہوا تو انھوں نے اپنی غذا میں بہت سی تبدیلیاں کرلیں۔

بیرسٹری پاس کرکے ہندوستان لوٹنے کے بعد انھوں نے بمبئی میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا اور کھانا پکانے کے لئے ایک برہمن باورچی رکھا۔ گاندھی جی آدھا کھانا خود ہی پکا لیتے تھے۔ انھوں نے باورچی کو کچھ انگریزی بناتالی کھانے بھی پکانے سکھائے انھیں خاص طور سے باورچی خانے کی صفائی اور ترتیب کا کچھ زیادہ ہی خیال رہتا تھا اس لئے باورچی کو اپنے کپڑے دھونے اور برابر نہانے کی تاکید کرتے تھے۔

جنوبی افریقہ یا ہندوستان کے کسی آشرم میں کبھی کوئی تنخواہ دار باورچی نہیں رکھا گیا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ ایک وقت کے کھانے کے لئے بہت سی چیزیں پکانا وقت اور محنت کی بربادی کرنا ہے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ آشرم میں رہنے والے مختلف لوگوں کے لیے ان کی پسند کے مطابق الگ الگ چیزیں پکائی جائیں انھوں نے سب کے لئے ایک سیدھا سادا نسخہ تجویز کردیا تھا۔ جو سب کا کھانا ایک ہی باورچی خانے میں تیار ہوتا تھا۔

انھوں نے کھانا پکانے کے پیچیدہ اور مشکل کام کو آسان بنا دیا تھا۔ آشرم میں دال چاول، روٹی، سلاد، بغیر مسالے کی اُبلی سبزیاں، پھل، دودھ یا دہی دیا جاتا تھا میٹھی یا دودھ کی بنی چیزوں کے بدلے گڑ اور شہد ملتا تھا۔

جسٹ کی کتاب 'رجوع بہ فطرت' (RETURN TO NATURE) نے گاندھی جی کو یہ باور کرادیا کہ کھانا مزے کے لئے نہیں بلکہ جسمانی تندرستی کے لئے کھانے چاہئیں۔ گاندھی جی نے غذائی تجربے شروع کئے۔ انھیں زندگی بھر اس کا شوق رہا۔ کبھی وہ بغیر پکا ہوا کھانا کھانے کا تجربہ کرتے تھے۔ بعض تجربوں نے انھیں خاصا پریشان کیا تھا۔ چند برسوں تک وہ محض پھل ہی کھاتے رہے۔ ایک بار چار مہینے تک وہ آ کو سے پھوٹے بیجوں اور بغیر پکے ہوئے کھانے پر گذارا کرتے رہے اور پیچش میں مبتلا ہو گئے۔

فینکس آشرم میں وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے اور ہیڈ باورچی بھی۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں نے کچھ یورپیوں کی دعوت کی تھی تو گاندھی جی نے بھی کھانا پکانے اور رکھانا لگانے میں ہاتھ بٹایا تھا۔

فینکس آشرم کے ستیہ گرہیوں کا پہلا گروپ جب آشرم سے جا رہا تھا تو گاندھی جی نے ان کو بڑے خلوص سے کھانا پکا کر کھلایا تھا۔ انھوں نے بے شمار چپاتیاں، ٹماٹر کی چٹنی، چاول، کڑھی اور کھجور کی کھیر تیار کی تھی۔ وہ کھانا تیار کرنے میں بھی مصروف رہے اور ستیہ گرہ کے کاموں کے بارے میں اور جیل کی زندگی سے متعلق مفصل ہدایتیں بھی دیتے رہے۔ جب ستیہ گرہیوں کی تعداد ڈھائی ہزار تک جا پہنچی تو گاندھی جی نے باترا

کرنے والوں کی رہبری کی اور ان کے لئے کھانا پکایا۔ ایک دن دال میں پانی زیادہ ہوگیا، دوسرے دن چاول آدھو کچرے رہ گئے لیکن لوگ اپنے گاندھی بھائی کا بڑا ادب کرتے تھے اس لئے بغیر شکایت کئے انھوں نے کچا پکا جیسا کچھ ملا کھالیا۔ جنوبی افریقہ کے جیل میں بھی گاندھی جی کھانا پکانے میں اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے تھے۔

گاندھی جی کھانا پکانا بھی تعلیم کا ایک اہم جزو سمجھتے تھے اور اس بات کو فخر کے ساتھ کہتے تھے کہ تالستائی فارم کا تقریباً ہر بڑا کا کھانا پکانا جانتا ہے۔ جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آتے ہی انھوں نے شانتی نکیتن کے طالب علموں میں بھی کھانا پکانے کا شوق پیدا کردیا۔ طالب علموں کو ایک اجتماعی باورچی خانے کا اور باری باری سے خود کھانا پکانے کا خیال بہت بھایا۔ ٹیگور کو اس اسکیم کے قابلِ عمل ہونے میں شبہ تو تھا لیکن ان کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔

مدراس میں طالب علموں کے ایک ہوسٹل میں یہ دیکھ کر گاندھی جی کو بہت دُکھ ہوا کہ وہاں نہ صرف مختلف فرقے کے لڑکوں کے لئے الگ الگ باورچی خانے ہیں بلکہ وہاں مختلف گروپوں کی الگ الگ پسند اور مزے کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک بار ایک بنگالی میزبان کے گھر میں ان کے سامنے بے شمار کھانے رکھے گئے۔ اسی وقت سے انھوں نے یہ پکا ارادہ کرلیا کہ وہ ایک دن میں صرف پانچ چیزیں کھایا کریں گے۔ انھوں نے بہار میں برسوں پرانے چھوت چھات کے فرق کو بھی ختم کیا اور ان تمام وکیلوں کو جو چمپارن کی تفتیش میں ان کی مدد کر رہے تھے ایک ہی باورچی خانے

میں اکٹھا کھانے پر تیار کر لیا۔ وہ زبان کے چٹخارے کے لئے کھانوں میں مسالے ڈالنے کی بجائے صحت مند اور صحت بخش کھانے پر زور دیتے تھے۔

گاندھی جی کی غذا کی فہرست میں چند عجیب و غریب چیزیں شامل تھیں۔ مثلاً کونین کی طرح کڑوی تازہ نیم کی پتیوں کی چٹنی، آشرم سے قریب کولہو سے حاصل کی ہوئی غذائیت سے بھرپور کھلی اور دہی کا مکسچر، گڑ اور املی سے تیار کیا ہوا میٹھا شربت، اُبلے ہوئے سویابین کا پھیکا بھرتہ، کسی بھی ہرے اور تازہ ساگ کی سلاد، چپاتیوں کے بھنے ہوئے چورے کی لپسی جو یا گیہوں کا دلیہ اور بھنے ہوئے گیہوں کے چورے کی کافی۔

انگلستان جاتے ہوئے گاندھی جی نے بحری جہاز سے اپنے بھتیجے کو لکھا تھا کہ "ہم نے دو حصے کیلے کے آٹے اور ایک حصہ گیہوں کے آٹے کو ملا کر بسکٹ اور روٹیاں پکائیں" ایک بار انھوں نے کیک بنانے کا یہ نسخہ لکھ کر بھیجا۔ "میدے کو تقریباً تین گھنٹے پانی میں بھگویا جائے پھر خوب اچھی طرح گھی ملایا جائے، اس کے بعد اس پر پانی ڈالا جائے اور اچھی طرح گوندھ لیا جائے"۔

گاندھی جی کیک، چاول، دال، سبزیوں کا شوربہ، سلاد، سنگترے اور اس کے چھلکے کا مربہ، خمیر یا خمیر اٹھانے والے پاؤڈر کا استعمال کئے بغیر ڈبل روٹی، چپاتی اور "کھاکھرا" تیار کر لیتے تھے۔ انھوں نے اپنے آشرم کے باورچی خانے میں بسکٹ اور نان پاؤ بنانا بھی شروع کئے۔ سیوا گرام میں ایک خاص قسم کا چولھا استعمال کیا جاتا تھا جس پر بہت کم خرچ سے سینکڑوں آدمیوں کے لئے چاول اور روٹیاں تیار ہو سکتی تھیں

اور سبزی اُبالی جا سکتی تھی ۔

ایک بار اُن کے ایک ساتھی نے کہا کہ "گھاس میں وٹامنوں کا پتہ ذرا دیر میں چلا۔ خوش قسمتی سے اس کھوج کی خبر اس وقت ہوئی جب گاندھی جی آشرم میں موجود نہیں تھے۔ ورنہ وہ باورچی خانہ بند کر دینے کا فیصلہ کر لیتے اور ہم سے میدان میں گھاس چرنے کے لئے کہتے "۔

ایک مرتبہ گاندھی جی ایک اقامتی ماڈل اسکول دیکھنے گئے۔ انھیں وہاں کے باورچی خانے کا انتظام پسند نہیں آیا۔ انھوں نے وہاں کے اُستادوں سے کہا کہ "اگر آپ بچوں کو کتابی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اُنھیں کھانا پکانا اور جھاڑو دینا بھی سکھا سکیں تو آپ اپنے اسکول کو واقعی ماڈل اسکول بنا سکتے ہیں "۔

ڈاکٹر

گاندھی جی نے راجکوٹ کے الفریڈ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کر لیا تو ان کے والدین نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انھیں لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ گاندھی جی نے ان سے پوچھا تھا کہ "کیا آپ مجھے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں بھیج سکتے؟" اُن کے بڑے بھائی نے انکار کر دیا کیوں کہ ایک وشنو خاندان کا لڑکا بھلا چیر پھاڑ کیسے کر سکتا ہے۔ گاندھی جی کے مرحوم باپ کو بھی یہ تجویز پسند نہیں آئی تھی۔ انتالیس سال کی عمر میں گاندھی جی جب دوبارہ جنوبی افریقہ سے انگلستان گئے اس وقت بھی انھیں ڈاکٹری پڑھنے کا خیال آیا تھا۔ لیکن اس بار پھر وہی چیر پھاڑ کرنے کا خیال رکاوٹ بنا۔ گاندھی جی زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کرنے یا سیرم SERUM تیار کرنے کے لئے ان پر طرح طرح کے تجربات کرنے کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی جسمانی ضرورتوں کے لئے بے شمار جانیں ضائع کرنے کی اجازت کوئی مذہب نہیں دیتا۔ اسی لئے ان کی رائے میں ایلوپیتھ ڈاکٹر شیطان کے چیلے تھے اور مغربی دوائیں کالے جادو کی حیثیت رکھتی تھیں۔ انھیں آیورویدک حکیموں کی اس بے حسی

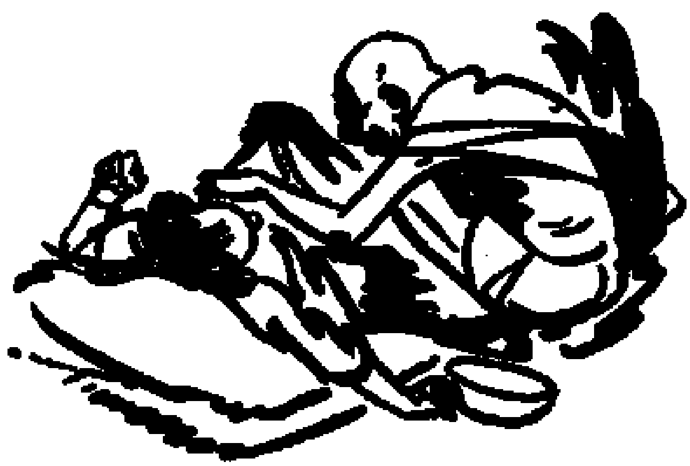

کا بھی بڑا غم تھا کہ وہ نئے نئے تجربات نہیں کرتے۔ ہومیوپیتھی سے انھیں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ بیماروں کو اچھا کر دینے کی دُھن نے انھیں اس وقت تک چین لینے نہیں دیا جب تک وہ "نیچروپیتھ" (قدرتی علاج کے معالج) نہیں بن گئے۔

انھوں نے کوہنی (KUHNE) کا مطالعہ کیا اور پانی کے ذریعہ اس کے علاج کے طریقے سے گاندھی جی بہت متاثر ہوئے۔ پہلے انھوں نے اپنے اوپر اور اپنے بیوی بچوں پر قدرتی علاج کے تجربے کئے۔ اس کے بعد گاندھی جی مٹی، ہوا، پانی اور دھوپ وغیرہ قدرتی چیزوں کے ذریعہ بیماریوں کا علاج کرنے لگے۔ گولیوں اور انجکشن لگا کر جسم کو زہر آلود کرنے کے بجائے وہ غذا میں پرہیز، فاقہ اور جڑی بوٹیوں کے استعمال پر زور دیتے تھے۔

گاندھی جی بڑی توجہ سے مریض کی حالت کی دیکھ بھال کرتے تھے اور مرض کی تشخیص کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس سے ان کو مرض کا علاج کرنے میں بڑی کامیابی ہوتی تھی۔ جنوبی افریقہ میں وہ پہلے "قلی بیرسٹر" ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے "قلی نیم حکیم" بھی تھے۔ بہت سے یورپی اور ہندوستانی مریض اُن کے پاس آتے تھے اور وہ اپنے بعض ہوکلو کے خاندانی ڈاکٹر بھی بن گئے تھے۔ اس وقت اُن کا علاج کا طریقہ آج کی میڈیکل سائنس کے اصولوں سے بالکل مختلف تھا۔ ہاں بعد میں ڈاکٹر اس کی کچھ کچھ حمایت کرنے لگے۔

ان کا لڑکا بیمار ہوا تو ڈاکٹروں نے اس کے لئے انڈے اور چوزوں کی یخنی تجویز کی۔ گاندھی جی اس کو کوئی غیر نباتاتی غذا دینے کے لئے بالکل تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے علاج کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ لڑکے کو پانی اور سنگترے کا رس دیتے رہے۔ اس کے جسم کو

گیلی چادر سے لپیٹ کر اوپر سے کمبل ڈھانک دیتے تھے۔ لڑکے پر جب ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تو اس وقت گاندھی جی کچھ گھبرائے لیکن وہ اپنے قدرتی علاج کے طریقے پر جمے رہے اور کامیاب ہوئے۔ انھوں نے ٹائیفائڈ کے اور بھی بہت سے مریضوں کو اسی طرح بغیر انجکشن لگائے اچھا کر دیا۔

انھوں نے ایک ڈاکٹر کے فیصلے کو ماننے سے کئی بار انکار کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ کستوربا خون کی کمی کے مرض (انیمیا) میں بری طرح مبتلا ہو گئیں۔ ڈاکٹر نے ان کو گائے کی یخنی پینے کی ہدایت کی، لیکن گاندھی جی اور کستوربا دونوں راضی نہ ہوئے۔ گاندھی جی نے کئی دن تک انھیں لیمو کا عرق دیا اس طرح وہ ٹھیک ہو گئیں۔ ایک بار انھوں نے کستوربا کو دال اور نمک کھانے کو منع کیا تو پل بھر کے لئے کستوربا کو اپنے شوہر کی سخت فطرت یاد نہ رہی اور وہ بڑبڑانے لگیں کہ "آپ کے لئے کسی چیز کا منع کر دینا بہت آسان ہے لیکن کیا آپ خود بھی ان چیزوں کو چھوڑ سکتے ہیں؟" گاندھی جی نے فوراً یہ جواب دیا کہ "اگر ڈاکٹر مجھ سے کہے تو میں یقیناً چھوڑ سکتا ہوں لیکن اب میں ڈاکٹر کے منع کئے بغیر ہی ایک سال تک دال اور نمک نہیں کھاؤں گا۔" کستوربا بہت روئیں دھوئیں، بڑی منتیں کیں لیکن گاندھی جی نے عہد کر لیا تھا اس پر قائم رہے۔ غرض اس طرح "مریض" اور "طبیب" دونوں نے نمک اور دال کھانا بند کر دیا۔

ایک اور موقع پر کستوربا کو پندرہ دن تک برت رکھنا اور روزانہ نیم کا عرق پینا پڑا۔ گاندھی جی پیٹ صاف رکھنے پر خاص زور دیتے تھے۔ جسم کے اندر جمع زہر کو ختم کرنے کے لئے وہ فاقہ کرنے یا نیم فاقہ کشی کرنے اور انیما لینے کا مشورہ دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ سر کا درد، بدہضمی، تخمہ اور قبض یہ ساری بیماریاں زیادہ کھا لینے اور جسمانی ورزش کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اُن کے نزدیک دور تک چہل قدمی، اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کا کامیاب نسخہ تھا۔ جیل میں بھی صبح اور شام وہ اس کے تنگ احاطے میں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ وہ سانس کی ورزشوں کے بھی بڑے حامی تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ذہنی الجھنیں اکثر جسمانی صحت کو خراب کر دیتی ہیں۔ رام نام کو وہ ذہنی الجھنوں کا علاج سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک رام نام کا مطلب پریشانیوں کو بھول کر خدا پر مکمل اعتماد کرنا تھا اور وہ اسی کو تمام مصیبتوں کا علاج سمجھتے تھے۔

جنوبی افریقہ میں جب گاندھی جی پر ایک پٹھان نے حملہ کیا تو انھوں نے اپنے زخمی چہرے، پیشانی اور پسلیوں پر صاف مٹی کا لیپ لگایا تھا، جس سے سوجن بہت جلد ٹھیک ہو گئی۔ انھوں نے پلیگ، میعادی بخار، ملیریا، ضعفِ معدہ، یرقان، بلڈ پریشر، چیچک، جلنے اور ہڈی ٹوٹ جانے کا علاج مٹی سے کیا تھا۔ ایک بحری سفر میں ان کے لڑکے کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ گاندھی جی نے مٹی لگا کر پٹی باندھ دی اور زخم ٹھیک ہو گیا۔ وہ بہت سے

مریضوں کا علاج کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے پھر بھی انھوں نے خبردار کر دیا تھا کہ ان کے تجربوں پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آنا ٹھیک نہیں ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس طرح کے نئے اور انوکھے تجربے کرنے میں بڑا خطرہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ان کی کتاب 'رہنمائے صحت' میں صحت مند رہنے کے لئے جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان میں بے باکی سے کام لیا گیا ہے۔ بعض چند اسپتال، زچہ خانے اور دوا خانے کھول دینے کی بجائے لوگوں کو صفائی ستھرائی اور صحت مند زندگی گزارنے کے طریقے بتانے میں انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اس اصول کے حامی تھے کہ "پرہیز علاج سے بہتر ہے۔"

اس کے باوجود گاندھی جی ایلوپیتھک دواؤں کو حرام بھی نہیں سمجھتے تھے۔ سیواگرام میں جب ہیضہ پھیلا تو انھوں نے آشرم والوں اور آس پاس کے گاؤں والوں کو ٹیکہ لگوانے کی اجازت دے دی۔ جیل میں 'اپنڈی سائٹس' ہو جانے پر انھوں نے اس کا آپریشن بھی کروایا تھا۔ جس پر لوگوں نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے انھیں بے شمار خطوط لکھے تھے اور گاندھی جی نے بھی اپنی یہ غلطی تسلیم کر لی تھی۔

گاندھی جی جانتے تھے کہ قدرتی طریقۂ علاج سب بیماریوں کا علاج نہیں ہے۔ پھر بھی بہت سی باتوں کو سامنے رکھ کر وہ اس کی حمایت کرتے رہے۔ کیوں کہ یہ طریقہ ہندوستان کے غریب عوام بہ آسانی اپنا سکتے ہیں اور یہ سو فی صدی سودیشی بھی ہے۔ ستتر سال کی عمر میں اس طریقہ سے ان کی دلچسپی بے حد بڑھ گئی اور انھوں نے ایک گاؤں میں علاج کے قدرتی طریقہ

ایک اور موقع پر کستوربا کو پندرہ دن تک برت رکھنا اور روزانہ نیم کا عرق پینا پڑا۔ گاندھی جی پیٹ صاف رکھنے پر خاص زور دیتے تھے۔ جسم کے اندر جمع زہر کو ختم کرنے کے لئے وہ فاقہ کرنے یا نیم فاقہ کشی کرنے اور انیما لینے کا مشورہ دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ سر کا درد، بدہضمی، تخمہ اور قبض یہ ساری بیماریاں زیادہ کھا لینے اور جسمانی ورزش کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اُن کے نزدیک دور تک چہل قدمی، اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کا کامیاب نسخہ تھا۔ جیل میں بھی صبح اور شام وہ اس کے تنگ احاطے میں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ وہ سانس کی ورزشوں کے بھی بڑے حامی تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ذہنی الجھنیں اکثر جسمانی صحت کو خراب کر دیتی ہیں۔ رام نام کو وہ ذہنی الجھنوں کا علاج سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک رام نام کا مطلب پریشانیوں کو بھول کر خدا پر مکمل اعتماد کرنا تھا اور وہ اسی کو تمام مصیبتوں کا علاج سمجھتے تھے۔

جنوبی افریقہ میں جب گاندھی جی پر ایک پٹھان نے حملہ کیا تو انھوں نے اپنے زخمی چہرے، پیشانی اور پسلیوں پر صاف مٹی کا لیپ لگایا تھا، جس سے سوجن بہت جلد ٹھیک ہو گئی۔ انھوں نے پلیگ، میعادی بخار، ملیریا، ضعفِ معدہ، یرقان، بلڈ پریشر، چیچک، جلنے اور ہڈی ٹوٹ جانے کا علاج مٹی سے کیا تھا۔ ایک بحری سفر میں ان کے لڑکے کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ گاندھی جی نے مٹی لگا کر پٹی باندھ دی اور زخم ٹھیک ہو گیا۔ وہ بہت سے

مریضوں کا علاج کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے پھر بھی انھوں نے خبردار کر دیا تھا کہ ان کے تجربوں پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آنا ٹھیک نہیں ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس طرح کے نئے اور انوکھے تجربے کرنے میں بڑا خطرہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ان کی کتاب 'رہنمائے صحت' میں صحت مند رہنے کے لئے جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان میں بے باکی سے کام لیا گیا ہے۔ محض چند اسپتال، زچہ خانے اور دوا خانے کھول دینے کی بجائے لوگوں کو صفائی ستھرائی اور صحت مند زندگی گزارنے کے طریقے بتانے میں انھیں بڑی دلچسپی تھی وہ اس اصول کے حامی تھے کہ "پرہیز علاج سے بہتر ہے"۔

اس کے باوجود گاندھی جی ایلوپیتھک دواؤں کو حرام بھی نہیں سمجھتے تھے سیوا گرام میں جب ہیضہ پھیلا تو انھوں نے آشرم والوں اور آس پاس کے گاؤں والوں کو ٹیکہ لگوانے کی اجازت دے دی۔ جیل میں 'اپنڈی سائٹس' ہو جانے پر انھوں نے اس کا آپریشن بھی کروایا تھا۔ جس پر لوگوں نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے انھیں بے شمار خطوط لکھے تھے اور گاندھی جی نے بھی اپنی یہ غلطی تسلیم کر لی تھی۔

گاندھی جی جانتے تھے کہ قدرتی طریقۂ علاج سب بیماریوں کا علاج نہیں ہے۔ پھر بھی بہت سی باتوں کو سامنے رکھ کر وہ اس کی حمایت کرتے رہے۔ کیوں کہ یہ طریقہ ہندوستان کے غریب عوام بہ آسانی اپنا سکتے ہیں اور یہ سو فی صدی سودیشی بھی ہے ستتر سال کی عمر میں اس طریقہ سے ان کی دلچسپی بے حد بڑھ گئی اور انھوں نے ایک گاؤں میں علاج کے قدرتی طریقہ

کا ایک مرکز "آروگی کٹیر" نام سے قائم کیا۔ اس مرکز میں کوئی قیمتی یا مکینیکل سامان نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک اچھے ڈاکٹر کو دواؤں کے بارے میں کافی معلومات ہونا چاہئیں۔ اپنی اس معلومات سے وہ لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ اس کا سودا نہ کرے۔ وہ ڈاکٹروں کی سالانہ آمدنی مقرر کر دینا چاہتے تھے تاکہ وہ امیر یا غریب کسی بھی مریض سے پیسے لینے کی امید رکھے بغیر ان کا علاج کریں۔ کچھ دنوں گاندھی جی نے بھی مریضوں کا معائنہ کر کے نسخے لکھے تھے۔ ایک نسخہ راجو کے لئے تھا جس میں لکھا تھا "دھوپ کا غسل۔ کولھوں کا غسل اور مالش۔ پھلوں کا عرق اور چھاچھ۔ دودھ بند۔ اگر چھاچھ ہضم نہ ہو تو پھلوں کا عرق اور جوش دیا ہوا پانی دیا جائے۔" دوسرا نسخہ پاروتی کے لئے تھا "غذا میں صرف موسمی کا رس۔ کولھوں کا غسل، مالش اور پیٹ پر مٹی کا لیپ، دھوپ کا غسل باقاعدگی کے ساتھ۔ اگر ان سب باتوں پر عمل کیا گیا تو وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کو "رام نام" کی اہمیت بھی سمجھا دو۔"

آشرم میں اکثر لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے "اگر تم باپو کی قربت چاہتے ہو تو بیمار پڑ جاؤ۔" گاندھی جی ہر مریض کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے باخبر رہتے تھے۔ روزانہ کی ہوا خوری سے فارغ ہو کر وہ ہر مریض کے پاس جاتے تھے۔ وہ مفصل ہدایتیں بھی دیتے تھے کہ کس طرح کی غذا تیار ہو گی، کس طرح مریض کے جسم کو اسفنج سے صاف کیا جائے اور اس کی مالش کس طرح کی جائے اور اینما کے لئے کتنا نمک یا سوڈا استعمال کیا جائے۔"

جس وقت انھوں نے سیوا گرام میں ہر صبح ایک گھنٹہ مریضوں کو دیکھنے کا فیصلہ کیا تو قریب کے گاؤں سے جوق جوق مریض آنے لگے۔ گاندھی جی انھیں مشورہ دیتے ۔ سبزی کھاؤ، چھاچھ پیو، مٹی لگاؤ۔ وہ اکثر مریض کے پاخانے کا خود معائنہ کرتے تھے۔ مریض اگر زیادہ کمزور نہ ہوتا تو اسے کھلی ہوا میں رکھتے۔ مرض کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی وہ اس کا علاج تجویز کرتے تھے۔ ان کے ایک ساتھی کے خون کا دباؤ عصبی کمزوری کی وجہ سے بڑھ جاتا تھا۔ اصل سبب دریافت کرنے کے لئے گاندھی جی نے پہلے دن ان سے بحث کی۔ دوسرے دن ان سے لکڑی کا تختہ کٹوایا، تیسرے دن انھیں ایک فرلانگ تک دوڑایا۔ ہر روز ان کاموں سے پہلے اور بعد میں وہ خون کے دباؤ کی جانچ پڑتال کرتے رہے۔ پتہ چلا کہ پہلے دو دن خون کے دباؤ میں اضافہ ہوا تھا لیکن تیسرے دن اس میں کمی ہو گئی۔ گاندھی جی نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ جب کبھی خون کا دباؤ زیادہ محسوس کرو تو ٹہل کر کم کر لیا کرو۔ گاندھی جی خواہ کتنے ہی ضروری کاموں اور اہم گفتگو میں مصروف رہتے ہوں مریض کے علاج، نہلانے دُھلانے اور غذا سے متعلق مشورہ کرنے کے لئے کوئی بھی شخص جا کر دخل دے سکتا تھا۔ بہت سے مشہور و معروف لیڈر بھی ان کی کڑی نگرانی میں رہ چکے ہیں تاکہ وہ ان کی حکم عدولی نہ کر سکیں۔ جیل میں بھی انھوں نے اپنے ساتھیوں کا علاج کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔

گاندھی جی کے ایک ساتھی ایک بار دمہ کا علاج کرانے اُن کے پاس آئے۔ گاندھی جی نے ان سے سگریٹ چھوڑ دینے کے لئے کہا، وہ راضی ہو گئے۔ تین دن گزر

گئے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ دراصل وہ چوری چھپے ایک دو سگریٹ پی لیتے تھے۔ ایک رات جب انھوں نے سگریٹ جلانے کے لئے ماچس جلائی تو ان کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے، معافی مانگی اور سگریٹ بالکل ترک کردی۔ جلد ہی انھیں دمے سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔ بادشاہ خاں کے سر میں کچھ درد تھا۔ گاندھی جی نے انھیں ایک گھریلو علاج بتا دیا۔ اس علاج نے پٹھان لیڈر کو بیماری سے بھی زیادہ تکلیف پہنچائی۔ ولبھ بھائی کے پاؤں میں ایک بار کانٹا چبھ گیا۔ گاندھی جی نے آیوڈین کے بجائے بھلاواں جلا کر لگا دیا۔ ولبھ بھائی بولے "اس تکلیف دہ علاج سے تو کانٹے کی چبھن زیادہ اچھی ہے"

نرس

چند کانگریسی رہنما گاندھی جی سے مشورہ کرنے کے لئے سیوا گرام گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بخار میں مبتلا دو آشرمیوں کو گیلی چادر میں لپیٹ رہے ہیں اور انھیں کولھوں کا غسل دے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نے گاندھی جی سے دریافت کیا کہ "کیا یہ سارے کام آپ ہی کو کرنے چاہئیں؟" گاندھی جی نے جواب دیا "پھر اور کون کرے؟ آپ ذرا گاؤں میں جاکر دیکھئے وہاں چھ سو میں سے تین سو آپ کو بیمار ملیں گے۔"

گاندھی جی کو بچپن ہی سے تیمارداری کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اسکول سے چھٹی ملتے ہی وہ دوڑتے ہوئے گھر آتے تاکہ اپنے بیمار والد کی تیمارداری کرسکیں۔ وہ اپنے والد کو دوا پلاتے، زخموں کی مرہم پٹی کرتے اور رویدوں کی بتائی ہوئی دوائیں تیار کرتے۔ عمر کے ساتھ ساتھ تو بیماروں کی خدمت کرنے کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ جنوبی افریقہ میں انھوں نے ایک خیراتی اسپتال میں روزانہ دو گھنٹے مریضوں کی تیمارداری کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہیں انھوں نے نسخے کے مطابق دوا بنانا سیکھا۔ اس کام کے لئے وقت درکار تھا، اس لئے انھوں نے بہت سے مقدمے اپنے ایک مسلمان دوست کے حوالے کردیئے کیوں کہ اب وہ ان تمام قانونی کاموں پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔

۱۸۹۶ء میں گاندھی جی بہت تھوڑے عرصے کے لئے ہندستان آئے تو وہ ہندستانی رہنماؤں کو جنوبی افریقہ میں آباد ہندستانیوں کی حالت بتانے ہی میں مصروف رہے۔ ان کا سارا وقت "سبز اشتہار" لکھنے اور تقسیم کرنے میں گزرا۔ اسی اثنا میں اُنھیں معلوم ہوا کہ اُن کے بہنوئی سخت بیمار ہیں۔ اور ان کی بہن اس قابل نہیں کہ کسی نرس کو رکھ سکیں۔ وہ بیمار بہنوئی کو اپنے گھر لے آئے، انھیں اپنے کمرے میں رکھا اور رات دن ان کی تیمارداری میں لگے رہے۔

گاندھی جی کے آٹھ سالہ لڑکے کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو گاندھی جی نے تقریباً ایک مہینے تک اس کی مرہم پٹی کی۔ اُنھوں نے ڈاکٹروں کی باندھی ہوئی پٹی کھول دی، زخم دھویا، اس پر صاف مٹی کی لیپ لگائی۔ اور جب تک ہاتھ درست نہیں ہوگیا اُسے بندھا رہنے دیا۔

دوسرا لڑکا جس کی عمر دس سال کی تھی اسے ٹائیفائڈ ہوگیا۔ گاندھی جی نے چالیس دن تک اُس کی تیمارداری کی۔ اُنھوں نے اس کے چیخنے، چلّانے کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اور اسے گیلے کپڑے میں لپیٹ کر اس پر کمبل ڈال دیا۔ وہ اپنے مریضوں کا بڑا خیال رکھتے۔ اور ان سے بے حد محبت کا اظہار کرتے تھے لیکن علاج کے معاملے میں وہ کوئی فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ ٹائیفائڈ میں مبتلا ایک دوسرے بچے کی تیمارداری کے دوران گاندھی جی نے پندرہ دن تک مٹی لگا کر اور کولھوں کا غسل کرا کے اس کا علاج کیا۔ ہر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد گاندھی جی اس کے پیٹ پر مٹی کا ایک انچ موٹا لیپ کرتے۔ بخار اترنے کے بعد بچے کو پکے کیلے کھانے کی اجازت مل گئی۔ گاندھی جی نے خود پندرہ منٹ تک کیلوں کا بھرتہ بنایا اور بچے کو بہلا پھسلا کر کھلا دیا۔ اُنھوں نے یہ کام

بچے کی ماں کے سپرد اس لئے نہیں کیا کہ کہیں وہ بچے کو زیادہ نہ کھلا دے۔ بیمار کا علاج کرتے وقت گاندھی جی بیمار کو ذہنی سکون پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ کسی بھی قسم کی لت کے خلاف تھے لیکن جنوبی ہند کے ایک بیمار بچے نے جب کافی پینے کی خواہش کی تو انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر دی تھی۔

وہ مریضوں کے مساج کرتے، اینما دیتے، نہلاتے اور مٹی کا لیپ لگاتے۔ وہ نرس سے زیادہ اپنے مریضوں کا خیال رکھتے۔ انھیں چھوت لگ جانے کا بالکل ڈر نہیں تھا۔ ایک بار ایک کوڑھی فقیر آیا۔ گاندھی جی نے اسے اپنے پاس ٹھہرایا، کچھ دنوں تک اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی، پھر اسے ایک اسپتال میں بھیج دیا۔ جیل کے اپنے ایک ساتھی کے جسم پر کوڑھ کے آثار نظر آنے پر گاندھی جی نے انھیں باقاعدگی سے جا کر دیکھنے کی اجازت حاصل کی۔ بعد میں وہی ساتھی، کئی سیوا گرام میں رہے۔ اور گاندھی جی روزانہ اُن کی مرہم پٹی کرتے رہے۔

گاندھی جی کو بوئر جنگ اور زولو کی بغاوت کے دوران بڑے پیمانے پر زخمیوں کی خدمت کرنے کے دو تاریخی موقعے ملے دونوں موقعوں پر انھوں نے ہندوستانی ایمبولینس کو تیار کیا جو بیماروں کی تیمارداری کرتی اور زخمیوں کو اٹھاتی تھی۔ وہ خود زخمیوں کو اسٹریچر پر لاد کر میلوں پیدل چلتے تھے یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ تیمارداروں کے اِس دستے کے ایک قابل رہنما ہیں۔ انھیں مظلوم زولو لوگوں کی تیمارداری کرکے بڑی خوشی ہوتی، رحم کی دیوی گوری نرسوں نے ان کی تیمارداری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالاں کہ ان کے زخم پک کر سڑنے لگے تھے۔ گاندھی جی گورے سپاہیوں کے لئے بھی دوائیں تیار کرتے تھے۔ اُن کی اِن خدمات کے عوض انھیں زولو وار

میڈل" اور "قیصر ہند طلائی تمغہ دیا گیا۔

جنوبی افریقہ کی سونے کی کانوں میں طاعون پھوٹ پڑا ! بہت سے ہندوستانی مزدور اس کا شکار ہوئے۔ جیسے ہی گاندھی جی کو اس کی اطلاع ملی وہ چار مددگاروں کے ساتھ وہاں جا پہنچے، آس پاس کوئی اسپتال نہیں تھا، اس لئے ایک خالی گودام کھولا گیا۔ اس میں کچھ بستروں کا انتظام کیا گیا اور ۲۳ مریضوں کو وہاں لے جایا گیا۔ گاندھی جی کے اس فوری عمل پر وہاں کی میونسپلٹی نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اور جراثیم کو مارنے والی دوائیں اور ایک نرس وہاں بھیج دی۔ طاعون سے بچنے کے لئے نرس کے پاس برانڈی کی کافی مقدار موجود تھی لیکن گاندھی جی اس کے قائل نہیں تھے وہ مریضوں کو دوا دیتے، ان کے بستر صاف کرتے ! ور رات کو اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کا دل بہلاتے ڈاکٹر کی اجازت لے کر گاندھی جی نے تین مریضوں کا مٹی لگا کر علاج کیا۔ اِن میں سے دو بچ گئے۔ لیکن نرس اور باقی دوسرے مریض مر گئے۔ وہ ہمیشہ بڑی احتیاط برتتے تھے۔ اور جب کام زیادہ ہوتا تو پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ دوسروں کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا خیال رکھنا بھی وہ تیمارداری میں فرض سمجھتے تھے۔ انیما دینے، کوڑھیوں کا غسل کرانے، بیٹھک سنان کرانے تیل کی مالش کرنے، مٹی کا لیپ لگانے اور گیلے کپڑے میں لپیٹنے کا گاندھی جی کو بڑا تجربہ تھا۔ اپنے خون کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے وہ اکثر اپنے سر پر مٹی کا لیپ لگاتے تھے۔ اپنی پیشانی پر مٹی باندھ کر انھوں نے جاپانی شاعر یونی نوگوچی سے کہا تھا کہ " میں ہندوستان کی خاک سے اٹھا ہوں اس لئے ہندوستان کی خاک کو تاج سمجھ کر میں اپنے سر پر لگاتا ہوں۔"

مریض کی حالت بگڑنے پر بھی گاندھی جی گھبراتے نہیں تھے اور حواس کھوئے بغیر اپنے بیوی بچوں

کی تیمارداری کرتے۔ کستوربا دوبارہ بیمار ہوئیں۔ ڈاکٹروں کو ان کے بچنے کی امید بہت کم تھی۔ گاندھی جی نے بڑے استقلال، ہمت اور مستعدی سے ان کی تیمارداری کی۔ گاندھی جی ان کے دانت صاف کرتے، ان کے لئے کافی بناتے، انھیں نہلا دیتے اور ان کے پاخانے کے برتن کی صفائی کرتے بلکہ ایک بار تو انھوں نے ان کے بالوں میں کنگھا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ صبح ہونے پر وہ انھیں کمرے سے باہر کھلی ہوا میں لے آتے اور ایک درخت کے سائے میں لٹا دیتے۔ سورج کے رُخ بدلنے کے ساتھ ساتھ وہ ان کی جگہ بھی بدلتے رہتے۔

جنوبی افریقہ میں کسی تجربہ کار دائی کا ملنا مشکل تھا۔ اور ایک "کالی" عورت کے لئے کسی گوری نرس کی خدمات حاصل کرنے میں اس کے انکار کا اندیشہ تھا۔ کستوربا کو ایک بچہ ہونے والا تھا۔ آخر گاندھی جی نے دایہ گیری کا مطالعہ کیا اور انھوں نے اپنے آخری بچے کی صحیح سلامت پیدائش میں کستوربا کی بڑی مدد کی۔

آغا خاں محل میں جب کستوربا آخری بار بیمار ہوئیں تو گاندھی جی اس وقت پچھتر برس کے تھے۔ انھوں نے کستوربا کو کولہوں کا غسل دے کر ان کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کی۔

ایک بار جب ان کا بڑھا ہوا اپنڈیسائٹس نکالنے کا آپریشن کیا جا رہا تھا تو ان نرسوں نے جو ان کی تیمارداری کرتی تھیں اس نرس اور کمپونڈر یعنی گاندھی جی کی بڑی تعریف کی تھی۔ ایک نرس نے کہا "تیمارداری کرنے میں ہمیشہ لطف نہیں آتا لیکن گاندھی جی کی تیمارداری کرنا بڑے لطف اور سعادت کی بات ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "تم نے اس سے پہلے اس طرح کی بات کبھی نہیں کہی۔" نرس بولی "مجھے اس سے پہلے ایسا کوئی مریض بھی تو نہیں ملا۔"

مُعلّم

کستوربا سے گاندھی جی کی شادی تیرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ دونوں ہم عمر تھے کستوربا پڑھی لکھی نہیں تھیں اس لئے نوعمر شوہر نے انھیں لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش کی مگر انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۱۹۱۴ء میں جب وہ بحری جہاز سے انگلستان جا رہے تھے تو روزانہ ایک گھنٹہ کیبن بائی کو گجراتی پڑھاتے تھے اور کستوربا کو رامائن اور گیتا پڑھ کر سُناتے تھے۔ اور سمجھاتے تھے کستوربا بڑی دلچسپی سے سنتی تھیں بہتر سال کی عمر میں جب آغا خاں محل میں گاندھی جی کے ساتھ نظربند تھیں اُس زمانے میں گاندھی جی کو فرصت تھی۔ اس لئے انھوں نے کستوربا کے لئے رامائن اور گیتا کے کچھ باب ترتیب دیئے۔ وہ روزانہ انھیں جغرافیہ گجراتی ادب اور گرامر بھی پڑھایا کرتے تھے۔ مگر عمر اور بڑھاپے کی ماری کستوربا کچھ سمجھ نہ پاتی تھیں جیل میں گاندھی جی نے ایک چینی قیدی کو انگریزی پڑھائی۔ ایک برٹش جیلر کو گجراتی اور اپنی پوتی کو تاریخ، جغرافیہ اور جیومیٹری پڑھائی۔ وہ بہتر سال کی عمر میں بھی وہ باآسانی جیومیٹری کی شکلیں بالکل ٹھیک بنا لیا کرتے تھے۔

گاندھی جی کو اپنی معلمانہ صلاحیتوں پر بڑا اعتماد تھا لیکن ان کے تعلیمی نظریے اور تعلیم کا طریقہ اس معیار سے بہت مختلف تھا جو اُس زمانے میں جاری تھا۔ جنوبی افریقہ میں ایک حجام، ایک کلرک، ایک دوکاندار، انگریزی سیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس نہ اتنا پیسہ تھا کہ ایک اُستاد رکھتے اور نہ اتنا

وقت تھا کہ باقاعدہ طور پر پڑھ سکتے۔ گاندھی جی روزانہ ان کو پڑھانے جاتے اور آٹھ مہینے میں انھیں اتنی انگریزی سکھا دی کہ وہ حساب کتاب رکھ سکیں اور کاروباری خط و کتابت کر سکیں۔

گاندھی جی نے اپنے بیٹوں کو اکثر زبانی سبق دیے۔ بچے دفتر تک اُن کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ اس مختصر سے وقت میں گاندھی جی راستہ چلتے ان سے ادب، ہنر اور دوسرے مضمونوں پر گجراتی میں گفتگو کرتے۔ گاندھی جی نے اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے کچھ دنوں تک ایک انگریز استانی بھی رکھی۔ اس کے علاوہ لڑکوں نے گاندھی جی کے انگریز دوستوں سے بھی انگریزی سیکھی تھی۔

فینکس آشرم میں گاندھی جی نے آشرم کے بچوں کے لیے ایک ابتدائی مدرسہ کھولا۔ وہ خود اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور ان کے دوسرے ساتھی اس مدرسہ کے اُستاد۔ وہاں مختلف مذہبوں کے طالب علم پڑھتے تھے۔ اور اُستادوں میں بھی انگریز، جرمن اور ہندوستانی تھے۔ اُستاد کھیتی باڑی کے کاموں میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ اکثر کیچڑ میں لت پت پیروں کے ساتھ کھیتوں سے سیدھے درجے میں چلے آتے تھے۔ گاندھی جی کبھی کبھی بچے کو گود میں لیے ہوئے سبق دیا کرتے تھے۔ جو کام وہ خود نہیں کر سکتے تھے، طالب علموں سے بھی وہ کام کرنے کے لیے نہیں کہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ بزدل معلم اپنے شاگردوں کو کبھی بہادر نہیں بنا سکتا۔ اُستاد کو اپنے طالب علموں کے لیے ایک جیتی جاگتی مثال بننا چاہیے۔ گاندھی جی کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ ہمیشہ نئی نئی باتیں سیکھنے کی فکر میں رہتے تھے۔ پینسٹھ سال کی عمر میں انھوں نے ستاروں کا مطالعہ شروع کیا تھا۔

فینکس آشرم کا مدرسہ ایک تجرباتی مدرسہ تھا۔ اکثر قاعدے بڑے سخت تھے۔ وہاں کی زندگی سادہ اور مشکل تھی۔ چائے، کافی اور کوکو پینے کی ممانعت تھی کیونکہ یہ تمام چیزیں غلام مزدور تیار

کرتے تھے۔ وہاں زیادہ تر یتیم طالب علم تھے۔ گاندھی جی کتاب سے لیں کبھی کبھی پڑھاتے تھے۔ وہ طالب علموں کے ذہنوں کو کتابی علم کا بوجھ ڈال کر مفلوج کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں یاد تھا کہ خود ان کے بچپن میں سبق رٹنے پر جو زور دیا جاتا تھا، اس نے پڑھنے کا سارا لطف غارت کر دیا تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے اور حساب سیکھنے کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ تعلیم میں تہذیبِ نفس اور تعمیرِ سیرت کو سب سے مقدم سمجھتے تھے۔ بچوں کو تمام مذہبوں کا احترام کرنا سکھایا جاتا تھا۔ رمضان میں مسلمان بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی روزہ رکھتے تھے۔ مسلمان بچے کبھی کبھی ہندو خاندانوں کے ساتھ رہتے یا انھیں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ وہ سب سبزی کھاتے تھے۔ سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر عبادت کرتے اور سب کو باغبانی، صفائی، جوتا بنانے، کپڑا سینے اور کھانا پکانے کا کام سکھایا جاتا تھا۔ طالب علم کو موسیقی سے لطف اٹھانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ہر شام کو پیانو کی سنگت پر دعائیں اور بھجن گائے جاتے تھے۔ ٹینس اور کرکٹ کھیلنے کے بجائے وہ چاہتے تھے کہ طلبا محنت و مشقت کے مختلف کام کریں تاکہ جسمانی طور پر وہ مضبوط رہیں۔ ٹالسٹائی فارم اور سابرمتی آشرم دونوں جگہ گاندھی جی نے جوتا بنانے کا کام سکھایا۔ ٹالسٹائی فارم میں انھوں نے اردو اور تامل زبان کے ابتدائی سبق بھی پڑھائے۔ کتابی تعلیم مادری زبان کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ وہ خود گجراتی، مراٹھی، ہندی، اُردو، تامل، انگریزی اور لاطینی زبانیں جانتے تھے۔

سابرمتی آشرم میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ طالب علموں کے سرپرست آشرم فنڈ میں اپنی مرضی اور خوشی سے چندہ کے طور پر کچھ دے دیتے تھے۔ چار سال سے زیادہ کی عمر کے بچوں کو اسکول ہی میں رکھا جاتا تھا۔ تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور معاشیات کی تعلیم مادری زبان میں دی جاتی تھی۔

سنسکرت، ہندی اور کوئی ایک دراوڑ زبان لازمی تھی۔ انگریزی ثانوی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اردو، تامل، تیلگو اور بنگالی کے حروف سے بھی واقف کرایا جاتا تھا۔ دن میں تین بار بہت سادہ، بغیر مرچ مسالے کا کھانا دیا جاتا تھا۔ اور بچوں کو سودیشی کپڑے کی سادی پوشاک پہننی پڑتی تھی۔ سودیشی چیزوں کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا۔ گاندھی جی لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے کے حامی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں جنس کے فرق کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔ لڑکے، لڑکیوں کے ساتھ رہنے اور ملنے جلنے کا موقع دینا چاہیے۔ غیر ضروری احتیاط اچھی نہیں ہوتی۔" جب کبھی لڑکوں اور لڑکیوں میں کوئی نامناسب بات ہو جاتی تو گاندھی جی اپنے نفس کی پاکی کے لئے برت سے کام لیتے۔

سوت کاتنے کے ساتھ روئی اوٹنا اور دُھنی صاف کرنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ بچوں کو پیشہ وارانہ کام سیکھنے کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ انکی پڑھائی کا کچھ خرچ نکل آئے۔ ان کو کوئی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ اِس ہفتے میں دو دن انھیں اپنا کام کاج کرنے کا کچھ وقت ضرور ملتا تھا جو طالب علم جسمانی اعتبار سے ٹھیک ہوتے تھے وہ سال میں تین مہینے پیدل گھومنے جاتے تھے۔ گجرات ودیاپیٹھ میں گاندھی جی انجیل کی کہانیاں سناتے اور انگریزی ادب کے خاص خاص حصے بھی پڑھاتے تھے۔

گاندھی جی اعلیٰ تعلیمی نظام کو بالکل بدل دینا چاہتے تھے۔ اُسے وہ محض چند اوسط درجے کے طبقے کے بچوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ملک کے لاکھوں عام لوگوں کے لئے مفید بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک غیر ملکی زبان سیکھنے کے لئے بچوں کا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور انھیں کتنی دماغی محنت کرنی پڑتی ہے۔ بچے آہستہ آہستہ اپنے ادب اور زبان سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم بھی ان میں کسی قسم کا اعتماد پیدا نہیں کرتی۔ اور وہ یہ سوچ کر پریشان رہتے ہیں کہ

اسکول اور کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کریں گے۔ گاندھی جی کی خواہش تھی کہ ابتدائی تعلیم ایسی ہو جو ہندوستان کی رنگارنگ تہذیبوں سے میل پر مبنی ہو جس میں ماضی کی روایات اور حال کے تجربات شامل ہوں۔ طالب علموں کو تندرست، دیانت دار اور دانش مند دیہاتی بنایا جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکیں۔ گاندھی جی بچوں کو لکھنے سے پہلے پڑھنا سکھانے کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچوں کا خط اچھا ہونا بھی ایک تعلیمی کام ہے لیکن خود ان کا خط خراب تھا اور اس پر وہ نادم تھے۔ اُستادوں کے لئے اُن کا مشورہ یہ تھا کہ وہ بچوں کو حروف سکھانے سے پہلے سیدھی اور ٹیڑھی لکیریں، تکون، پرندوں، پھولوں اور پتوں کی شکلیں بنانا سکھائیں۔ اس طریقے سے بچوں کو اپنا خط سُدھارنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ان کے نزدیک موجودہ ابتدائی تعلیم بالکل مذاق تھی کیوں کہ یہ ہندوستان کی اور یہاں کے دیہاتوں کی ضرورتیں پوری نہیں کرتی۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ بچوں کی تمام صلاحیتیں اُجاگر ہوں۔ وہ فقط پڑھے ہوئے ہی نہ ہوں بلکہ راست باز بنیں۔ تعلیمی معاملات پر تیس سال غور و فکر کرنے کے بعد آخر انھوں نے تعلیم کا ایسا نظام پیش کیا جس کا تعلق چرخہ یعنی ہاتھ کے کام سے ہو۔ تریسٹھ سال کی عمر میں انھوں نے پہلے پہل اپنا تعلیمی نظریہ جیل میں مُرتب کیا تھا۔ بعد میں یہی نظریہ بنیادی تعلیم یا واردھا تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہوا

گاندھی جی ہر طرح کی جسمانی سزا کے خلاف تھے۔ زندگی میں صرف ایک بار انھوں نے ایک شریر بچے کو رول سے پیٹا تھا۔ لیکن اس سزا پر وہ خود کانپ اٹھے اور اس طرح اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکنے پر انھیں بڑا دکھ ہوا۔ اس بچے کو بھی مار کھانے کی اتنی تکلیف نہیں ہوئی جتنی اس بات سے کہ اس کی وجہ سے باپو کو اتنی ذہنی تکلیف پہنچی۔ اس نے گاندھی جی سے رو رو کر معافی مانگ لی۔

گاندھی جی کھیل کود میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے لئے طلبار کی ہمت بڑھاتے تھے۔ لیکن پڑھائی میں دوسروں کو نیچا دکھانے کے لئے وہ ان کی کبھی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے۔ نمبر دینے کا اُن کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ وہ سب سے اچھے طالب علم کے کام سے دوسرے لڑکوں کا مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ ہاں اگر طالب علم لکھائی پڑھائی میں ترقی کرتا تھا تو اس کو زیادہ نمبر دیتے تھے۔ انھیں طلبار پر پورا بھروسہ تھا، اسی لیے امتحان کے وقت بھی اُن کی نگرانی نہیں ہوتی تھی۔ آشرم کی تعلیم کا رہنما اصول "بچوں کی آزادی تھا"۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی کی نصیحت یہ تھی کہ "چھوٹے سے چھوٹے بچے کو بھی اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ کچھ ہے"۔

گاندھی جی کی آرزو تھی کہ ہر گاؤں میں بنیادی اسکول ہوں لیکن انھیں معلوم تھا کہ ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسکول یا کم از کم اُستاد خود کفیل نہ ہو جائیں۔ اس لئے بنیادی اسکول کے طلبار کو تھوڑی بہت دستکاری خصوصاً سُوت کاتنا ضرور سیکھنا چاہیے۔ گاندھی جی کو اس پر یقین تھا کہ مساوات کے صحیح تصور کو فروغ دینے اور دُنیا میں حقیقی امن قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ کام بچوں سے شروع کیا جائے۔ اگر لکھائی پڑھائی کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ بچے ہاتھ سے کام کرنا بھول جائیں اور محنت و مشقت کے کام کرنے میں عار محسوس کریں تو اس سے کہیں اچھا یہ ہے کہ وہ ان پڑھ رہیں اور پتھر توڑیں۔ انھوں نے اپنے پوتے کو بتایا تھا کہ "روئی کس طرح پیدا ہوتی ہے، تکلی کی چکی کیسے بنتی ہے، سُوت سے کپڑا کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ اور سوت کے تاروں کو کس طرح گنا جاتا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے اپنے پوتے کو جغرافیہ، مطالعۂ فطرت، حساب، جیومیٹری اور تہذیب کی ترقی کی تعلیم دی تھی۔

سوت کاتنے اور اس کی مختلف منزلوں کے بارے میں طالب علموں کی جانچ کے لئے گاندھی جی جو سوالات ترتیب دیتے تھے وہ قدرے مشکل ہوتے تھے۔ اور طلباء سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ انھیں ہاتھ سے سوت کاتنے کے تمام نظری اور عملی مسئلوں پر عبور حاصل ہو۔ گاندھی جی نے دکھا دیا کہ بنیادی تعلیم کس طرح طالب علم کو بڑی عمر تک پہنچنے پر گھر کا ایسا فرد بنا دیتی ہے جو تھوڑا بہت کما بھی سکے۔

نئی تعلیم کا مقصد صرف پیشہ ورانہ تعلیم دینا نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد بچے کی تمام انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ طالب علم نہ توکری (عہدہ) پر مغرور ہوں اور نہ جھاڑو دینے میں عار محسوس کریں۔ وہ کہتے تھے کہ محض کتابی تعلیم کسی شخص کی اخلاقی بلندی یا سیرت کی تعمیر میں کچھ بھی اضافہ نہیں کر سکتی۔

گاندھی جی نے طالب علموں کے جلسوں میں جو تقریریں کیں ان میں اور کاشی ودیا پیٹھ کے تقسیم اسناد کے جلسے کے خطبے میں اکثر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ طالب علموں کو تعلیم اس لئے نہیں دی جاتی کہ انھیں اچھی ملازمتیں اور عہدے ملیں بلکہ اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ قومی زندگی کو تقویت دیں اور بہادر سپاہی اور راست باز اچھے انسان بنیں۔ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کسانوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کریں اور یہ سوچیں کہ ان کی زندگی کس طرح بہتر بنائی جائے۔ لاکھوں انسانوں کی بے بسی اور وہم پرستی کو دور کرنے کے لئے بالغوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دینا بہت ضروری ہے۔

لیکن ٹالسٹائی اور رسکن کے تعلیمی نظریوں نے گاندھی جی کو متاثر کیا تھا۔ دنیا کے جن مشہور لوگوں نے تعلیمی تجربے کئے ہیں، گاندھی جی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے بہار میں چند اسکول چلائے

میں ایک قومی کالج اور احمد آباد میں ایک قومی یونیورسٹی قائم کی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس طرح کے نئے نئے نظریات پیش کرنے والے اس استاد کو اپنی نوجوانی کے زمانے میں محض اس وجہ سے کہ وہ گریجویٹ نہیں تھا پچھتر روپے پانے والے استاد کی جگہ پر نہیں رکھا گیا تھا، حالاں کہ اس وقت وہ لندن کا میٹرک پاس اور بیرسٹر تھا۔

جولاہا

ایک مرتبہ گرفتاری کے بعد مجسٹریٹ نے گاندھی جی سے دریافت کیا کہ ان کا پیشہ کیا ہے؟۔ گاندھی جی نے بتایا کہ "میں ایک جولاہا، سوت کاتنے والا اور ایک کسان ہوں۔" اس وقت ان کی عمر چونسٹھ سال کی تھی۔ اس واقعہ سے پچیس سال پہلے انھوں نے ایک کتاب "ہند سوراج" لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے سُودیشی چیزوں کے استعمال پر اور ہندوستان کو اندرونی اور بیرونی مفاد پرستی سے چھٹکارا دلانے کی ضرورت پر بہت زور دیا تھا۔ اس وقت تک ہتھ کرگھا ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا نہ وہ ہتھ کرگھے اور چرخے کے فرق سے واقف تھے لیکن وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ انگلستان سے کپڑے کی درآمد نے ہندوستانی جولاہوں کو کتنا تباہ کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں نے غیر ملکی نمائشی سامان کو ترجیح دے کر ہندوستان کی سرزمین پر ایک غیر ملکی حکومت کو بڑی مضبوطی کے ساتھ جمنے کا موقع دیا۔ گاندھی جی نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے کارخانوں کے بنے کپڑے کی برآمد میں اضافہ کرنے کے لئے ہندوستانی جولاہوں پر کتنا ظلم کیا تھا اور انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالیں جن سے بہترین ململ تیار ہوتی تھی۔

دو سو سال پہلے تک ہندوستان ایک سال میں تیس لاکھ روپے کی مالیت کا ہاتھ سے بُنا ہوا کپڑا برآمد کر لیتا تھا لیکن ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے بعد چالیس سال کے اندر ساری برآمد

ختم ہوگئی اور سو سال بعد ہندوستان میں ہر سال انگلستان کی برآمد کا ایک چوتھائی ساٹھ کروڑ روپے کی مالیت کا سامان آنے لگا۔ اس طرح ہندوستانی ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی پیداوار جس پر دنیا رشک کرتی تھی، تباہ ہوگئی۔ جولاہوں کا اپنا پیشہ ختم ہوگیا۔ انھوں نے کھیتی باڑی شروع کی اور بھوک کے مرنے لگے۔ ایک وائسرائے نے کہا تھا کہ "جولاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کو سفید کر رہی ہیں۔ تجارت کی تاریخ میں تباہی کی ایسی مثال مشکل سے ملے گی۔"

گاندھی جی کو معلوم ہوا کہ بنگال کے مسلمان جولاہے جو دنیا بھر میں مشہور "شبنم" بنتے تھے بے کار ہوگئے اور پنجاب کے جولاہے اپنا پیشہ چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہونے لگے اور ہندوستان کے لئے غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہنے کا سبب بن گئے ہیں۔ وہ پیشہ جو کبھی عزت اور ان کی حیثیت رکھتا تھا اب اسے حقیر سمجھا جانے لگا ہے۔ گجرات کے جولاہے اپنا وطن چھوڑ کر کام کی تلاش میں نکلے اور بمبئی جیسے بڑے شہروں میں بھنگی کا کام کرنے لگے۔ ان کی صحت خراب ہوگئی، وہ شراب پینے لگے، جوا کھیلنے لگے اور اسی طرح کی برائیوں میں مبتلا ہوگئے۔ بہت سے گھر بگڑ گئے۔ یہ ہنرمند دستکار بے کار مزدور بن گئے۔ مشینوں اور کارخانوں نے امیر کو اور زیادہ امیر بنا دیا۔

گاندھی جی نے اپنے ملک کو اس غلامی سے نجات دلانے اور بدیشی کپڑے کی درآمد روکنے کا تہیہ کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ سودیشی چیزوں کا اپنانا اور مقامی مصنوعات کا استعمال کرنا سوراج کی بنیاد ہے۔ اپنے ہم وطنوں کو خود کفیل بنانا ان کی زندگی کا پہلا مقصد بن گیا۔ اس کے لئے انھوں نے چند شرطیں رکھیں وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ سودیشی کپڑے کی تیاری کے لئے کارخانوں کی تعداد بڑھائیں۔ کارخانہ کا مالک سرمایہ دار ہوتا ہے۔ اس کی پیچیدہ مشینری کے کل پرزے باہر سے درآمد کئے جاتے ہیں۔ یہ بے شمار

دستکاروں کے ہاتھوں کو بے کار کر دیتے ہیں۔ اور مزدوروں سے ناجائز نفع کمانے کا موجب بنتے ہیں۔ مزدور گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں اور مشینی انسان کی طرح مشینی طور پر کام کرنے لگے ہیں۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ اگر ہماری پسند کا معیار کھرا ہوتا تو ہم جسم سے چپکے رہنے والی مل کی چھینٹ کے مقابلے میں کھدر کو ترجیح دیتے۔ پہلی قسم کا کام زندگی لیتا ہے اور دوسری قسم کا فن زندگی بخشتا ہے۔ مشینوں سے سامان بڑے پیمانے پر تیار ہو جاتا ہے، لیکن دستکار کی انگلیوں کی مہارت اور تخلیقی خواہش کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔" گاندھی جی دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ "آسام کی عورتیں کپڑے کی بنتی میں شاعری کرتی ہیں۔"

گاندھی جی ہاتھ کی بنائی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ کاش وکیل اور ڈاکٹر اپنا اپنا پیشہ چھوڑ کر ایک ہتھ کرگھا لے لیں۔" انھوں نے براہ راست جولاہوں سے تعلق قائم کیا اور ہتھ کرگھے کے بارے میں بالکل صحیح معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے ہندوستان میں اپنا پہلا آشرم قائم کرنے کے لئے احمد آباد کا انتخاب کیا کیوں کہ یہ ہتھ کرگھا کی صنعت کا مرکز تھا۔ انھوں نے سابرمتی آشرم میں ہتھ کرگھے لگائے۔ آشرم کے رہنے والے تمام لوگوں نے بدیشی چیزوں کے استعمال نہ کرنے کا عہد کیا۔ وہ سب اپنے کرگھوں پر بنے کپڑے ہی استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "اپنا کپڑا خود بنو ورنہ بغیر کپڑے کے کام چلاؤ۔"

ایک ماہر جولاہے کی نگرانی میں بنائی کی ایک کلاس شروع کی گئی اور آشرم کے لوگوں نے آٹھ آٹھ گھنٹے تک کرگھا چلایا۔ پینتالیس سال کی عمر میں گاندھی جی ہر روز باقاعدہ چار پانچ گھنٹے تک کپڑا بنا کرتے تھے۔ کپڑا بننے والا ہر شخص روزانہ بارہ آنے کما لیتا تھا۔ شروع میں تیس انچ عرض کا کپڑا بنا گیا۔ عورتیں اس کپڑے میں جوڑ لگا کر اپنی ساڑھیاں بناتی تھیں۔ ایک دن ایک عورت نے شکایت کی کہ اس کی ساڑھی کا عرض چھوٹا ہے اس لئے اسے مل کی ساڑھی پہننے کی اجازت دی جائے۔ اس کے شوہر نے گاندھی جی سے ذکر کیا۔ گاندھی جی

نے اس سے کہا کہ وہ چوڑے کرگھے پر ساڑھی بننا سیکھ لے۔

اس کے بعد ہی آشرم میں چوڑے عرض کی ساڑھیاں اور دھوتیاں بُنی جانے لگیں۔ دوسرے پیشہ ور جولاہے بھی ہاتھ سے کپڑا بننے لگے لیکن وہ اکثر زیادہ قیمت طلب کرتے تھے۔ وہ مشینی سُوت سے کپڑا بُننا پسند کرتے تھے کیوں کہ اس سے کپڑا بننا زیادہ آسان تھا۔ آزادی کے بعد کھادی کا کام کرنے والے ایک شخص نے مشورہ دیا کہ حکومت سوت کاتنے والوں کو مالی امداد دے۔ دوسرے نے کہا جب تک جولاہے ہاتھ سے کتے ہوئے سوت کی ایک خاص مقدار کا کپڑا نہ تیار کریں، انھیں مشینی سوت نہ دیا جائے۔ گاندھی جی نے ان خیالات کی تائید نہیں کی کیوں کہ اس طرح کی زبردستی کھادی سے ناپسندیدگی کا سبب بن جاتی اور جولاہے بھی یہ زبردستی برداشت کرنے سے بجا طور پر انکار کر سکتے تھے۔ گاندھی جی نے انھیں مشورہ دیا کہ وُہ سوت بہتر بنائیں تاکہ جولاہوں کو ہاتھ سے تیار کئے ہوئے سوت سے کپڑا بُننے میں دشواری نہ ہو۔ اُنھوں نے جولاہوں کو خبردار کیا کہ مشینی سوت پر بھروسہ کرنے سے کس طرح آخر میں وُہ خود اپنے پیشے کو تباہ کرلیں گے۔ کارخانے کے مالک اِنسان دوست نہیں ہوتے۔ وہ جیسے ہی ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑوں کو کارخانے کے کپڑوں کا مقابلہ کرتے دیکھیں گے، ویسے ہی وہ تمہیں سُوت دینا بند کر دیں گے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ "اگر ہم چرخہ چلانے کے ساتھ ساتھ تمام لوگوں کو کرگھا چلانے کی ہدایت بھی کرتے تو یہ مشکلیں پیدا نہ ہوتیں۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے چرخا کاتنے کی طرح ہر شخص کو کپڑا بننے پر بھی زور دیا۔"

چرخہ چلانے والا

گاندھی جی نے کارخانوں سے حاصل کئے ہوئے سوت سے ہتھ کرگھے پر کپڑا بننا سیکھا لیکن اس سے وہ مطمئن نہیں تھے کہ اس طرح محتاجی ختم نہیں ہوتی۔ وہ کپڑا بننے کے پہلے کے سب مرحلوں میں مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے وہ چرخہ ڈھونڈھ نکالا جس کی آواز کبھی گاؤں کے ہر گھر میں گونجتی تھی۔ آشرم کی ایک خاتون نے کسی گاؤں میں چرخہ چلتے دیکھا اور گاندھی جی سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے جلد ہی آشرم کے رہنے والوں کو چرخے کے استعمال کی تعلیم دینے کے لئے سوت کاتنے والے ایک ماہر کی خدمات حاصل کیں۔ ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں چرخے کی آواز کی موسیقی سے اُن کو بڑا سکون ملا۔ بیماری سے اُٹھنے کے بعد ہی انھوں نے چرخہ چلانا سیکھ لیا۔ اور یہ عہد کیا کہ روزانہ آدھ گھنٹہ سُوت کاتے بغیر وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ ان کے نزدیک سُوت کاتنا ایک روحانی مقدس عہد بن گیا تھا، وہ اپنے اس عہد پر تیس سال تک جب تک زندہ رہے، قائم رہے۔ سفر میں وہ چلتی گاڑی یا ہچکولے کھاتے جہاز پر بھی سُوت کاتا کرتے تھے۔ اگر سارا دن لوگوں سے ملاقات کرنے، ان سے اہم معاملات پر گفتگو کرنے یا عام جلسوں میں تقریر کرنے میں صرف ہو جاتا تو سُوت کاتنے کی اپنی مقدار وہ آدھی رات کو پوری کر لیتے۔ ایک بار ان کے سیدھے ہاتھ میں تکلیف تھی تو انھوں نے مہینوں تک بائیں ہاتھ سے چرخہ چلایا۔

وہ عام جلسوں میں اسٹیج پر بیٹھ کر بھی سوت کاتتے تھے۔ ایک بار ایک طویل گفتگو میں ٹیگور نے گاندھی جی سے کہا کہ "میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔" گاندھی جی نے جواب دیا "نہیں، میں تو بات چیت کے دوران بھی مستقل سوت کاتتا رہا ہوں۔ سوت کاتتے وقت ہر لمحہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں قومی سرمائے میں اضافہ کر رہا ہوں۔ اگر ایک کروڑ لوگ روزانہ ایک گھنٹہ سوت کاتیں تو قومی سرمائے میں ہر روز پچاس ہزار روپے کا اضافہ ہو جائے۔ چرخہ چلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی آدمی یا عورت کی روزی ماری جائے۔"

گاندھی جی چاہتے تھے کہ غریب آدمی بھی اپنی ضرورتیں آپ پوری کرلے۔ آپ اپنے کپڑے بنے اور پہنے امیر لوگ مدد کی طور پر سوت کاتیں اور اپنا سوت غریبوں کو دان دے دیں۔ انھوں نے "کرم یگیہ" میں شامل ہونے کے لئے بغیر کسی بھی فرق کے ہر ہندوستانی کو دعوت دی۔ وہ ٹیگور اور رمن جیسے لوگوں سے بھی توقع رکھتے تھے کہ وہ علامتی طور پر سوت کاتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بادشاہ اور کسان جیسے پیٹ بھرنے کے لئے کھانا کھاتے ہیں اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا پہنتے ہیں اسی طرح دونوں کو محنت بھی کرنا چاہئے۔ ان کا قول تھا کہ "میرا دعویٰ ہے کہ میں جو سوت کاتتا ہوں اس کے ہر تار کے ساتھ میں ہندوستان کی تقدیر بنتا جاتا ہوں۔ چرخہ کاتے بغیر ملک کو نجات نہیں مل سکتی۔" طالب علموں سے وہ کہا کرتے تھے کہ "آپ جو کھدر پہنتے ہیں اس کے ایک ایک گز کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں کی جھولی میں چند سکے پڑ رہے ہیں۔ ہاتھ کا بنا موٹا کپڑا سادگی کی نشانی ہے۔ کھادی میں زندگی کی ایک روح ہے۔"

وہ گھٹیا اور خراب کھادی بنانے کے خلاف تھے اور خریداروں کی پسند کو بھی معیار نہیں سمجھتے تھے۔ کھادی کو سفید بنانا انھیں پسند نہیں تھا۔ اور انھوں نے کھادی بھنڈاروں سے کہا تھا کہ وہ عام

پسند (فیشن) کے مطابق نہ چلیں بلکہ عوام میں ایک نیا ذوق پیدا کریں۔

انھوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ جو لوگ سال میں چار چھ مہینے بے کار رہتے ہیں وہ چرخہ چلائیں۔ اعتراض کرنے والوں نے گاندھی جی کی اس کوشش کا کہ وہ اس مشینی دور میں قدیم فن کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں، مذاق اڑایا۔ گاندھی جی نے ان کے جواب میں یہ دلیل پیش کی کہ "اب تک سلائی کی مشینیں سوئی کی جگہ نہیں لے سکی ہے، نہ ٹائپ رائیٹر کی ایجاد کے باوجود ہاتھ سے لکھنے کا فن ختم ہوا ہے۔ اس لئے سوتی ملیں اور چرخے دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ چرخے سب ہی لوگ چلا سکتے ہیں۔ اور دور دور کے گاؤں تک میں انھیں پہنچایا جاسکتا ہے۔ مل چھوٹی آبادی والے علاقے میں کم سے کم تعداد تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں تحریک ترک موالات اور بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ سے پہلے جب چند مہمان ان کے پاس آئے تو گاندھی جی نے یہ دکھانے کے لئے کہ وہ اور ان کی بیوی اپنے کپڑے خود بُن لیتے ہیں۔ بیٹھ کر چرخہ کاتنے لگے۔ انھوں نے رات دن اسی چرخے کی بات کی۔ اسی کے بارے میں لکھ کر سارے ملک میں تحریک چلا دی۔ موتی لال نہرو نے اپنے سارے ولائتی کپڑے جلا دیئے اور کھادی پہننا شروع کر دیا۔ انھوں نے ایک بار الٰہ آباد کی سڑکوں پر پھیری لگا کر کھدر بیچا تھی۔ اسی طرح ہزاروں لوگوں نے ان کی پیروی کی۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں چرخہ سنگھ قائم ہوا۔ پچاس ہزار چرخے چلنے لگے۔ پندرہ سو دیہاتوں میں تقریباً پچاس ہزار سوت کاتنے والوں کے علاوہ بہت سے جلاہوں، رنگائی، چھپائی کرنے والوں، اور درزیوں کو کام ملا تکلی اور چرخے بنانے کے لئے گاؤں کے بڑھئی اور لوہار بھی کام سے لگ گئے۔ چرخہ

ایک بار پھر لاکھوں کو زندگی بخشنے والا، عورتوں کی عزت آبرو کا نگہبان اور بھوکوں کی روزی کا سبب بن گیا۔

اگلے پانچ سال کے عرصہ میں کھادی کی پیداوار اور فروخت میں بہت اضافہ ہوا اور ایک لاکھ سے زائد سُوت کاتنے والے کام میں لگ گئے۔ تربیت پانے والوں کو کھادی بُننے کے تمام کاموں کی تربیت دی گئی۔ گاندھی جی نے دعویٰ کیا "میں نے دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جو چھوٹی سی اس مشین کا مقابلہ کر سکے۔ ایسا کوئی دوسرا ادارہ نہیں جس نے چرخہ سنگھ کی طرح تھوڑی سی پونجی لگا کر اٹھارہ سال کے اندر چار کروڑ روپے ضرورت مند مردوں اور عورتوں کو دیئے ہوں" ایسے بہت سے گھرانے تھے جنھوں نے روئی پر محض ایک پیسہ لگا کر کتائی شروع کی تھی اور اگلے دن سُوت کو فروخت کر کے دُگنے پیسے کمائے۔ اس طرح وہ لوگ کچھ دنوں بعد اپنے ہاتھ کے بُنے کپڑے پہننے کے قابل ہو گئے تھے۔

اس چرخے کے لئے ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا جو کم قیمت پر بہتر سُوت پیدا کرے۔ یروداجیل میں گاندھی جی نے ایک عجیب سا چرخہ بنایا اور وہ یرودا چرخے کے نام سے پکارا جانے لگا۔ بعد میں گاندھی جی نے سستی اور سیدھی سادی "دھنش تکلی" کو رواج دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اس پر اب بھی اتنا ہی باریک اور مضبوط سوت کات سکتے ہیں جیسا چرخے پر کاتتے تھے۔ ان کا سُوت زیادہ باریک تو نہیں لیکن ہموار اور خوب بل دار ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ کے کتے سُوت کی بنی ساڑھیاں کستوربا کو دیں۔ کستوربا خود بھی باقاعدگی سے سُوت کاتا کرتی تھیں۔ کسی شخص نے گاندھی جی سے کہا کہ سُوت کاتنے سے روزانہ صرف ایک یا دو آنے ہی مل پاتے

ہیں۔ گاندھی جی نے کہا "ہندوستان میں فی کس شیکل سے تین پیسے روزانہ آمدنی کا اوسط ہے۔ اگر میں چرخے کی مدد سے اس آمدنی میں تین پیسے کا بھی اضافہ کرتا ہوں تو چرخے کو ایسی گائے کہنا چاہیئے جس سے بے شمار لوگ دودھ پیتے ہوں۔"

گاندھی جی گاؤں کی عورتوں کی اور ان لوگوں کی مزدوری مقرر کر دینے پر زور دیتے رہے جو فی گھنٹہ دو پیسے کی معمولی سی اُجرت کے لئے اکثر ملوں میں سے پیدا چل کر آتے ہیں۔ آخر ایک دن کم سے کم تین آنے مزدوری مقرر کر دی گئی۔

گاندھی جی نے چرخہ کو محض کمائی کا ذریعہ ہی نہیں سمجھا بلکہ اُن کا خیال تھا کہ چرخہ لوگوں میں قوت اور توانائی پیدا کرتا ہے۔ تنظیمی قوت کو بڑھا وا دیتا اور لوگوں میں بھائی چارہ پیدا کرتا ہے۔ یہ لوگوں کو محنت و مشقت کی اہمیت سکھاتا ہے اور اہنسا، انکساری، آزادی اور خدمت کا نشان ہے۔ یہ بہت معمولی اور سستی چیزوں سے بنتا ہے۔ اور اس کی مرمت بھی آسان ہے۔ اور یہ ہاتھوں کی اس مہارت کو بڑھاتا ہے جو زراعت ایک بنیادی حرفے کی حیثیت سے نہیں کر سکتی۔ اس کو بنانے کے لئے بہت زیادہ قابل انجنیروں کی ضرورت نہیں یا اس خوبصورت اور تخلیقی فن کو سکھانے کے لئے بڑے بڑے ماہر اُستادوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جھونپڑیوں میں بیٹھ کر کمزور بوڑھے اور پانچ سال کے بچے بچیاں بھی چرخہ چلا سکتے ہیں۔

ایک شخص نے ان سے پوچھا تھا کہ وُہ ہندوستانی جو کبھی مشین سے زیادہ باریک اور اچھا کپڑا بنتے تھے اور جو نہ صرف اپنی ضرورت پوری کرتے تھے بلکہ دور دراز کے ملکوں کی بھی ضرورتیں پوری کیا کرتے تھے وہ غریب اور غلام کیسے ہو گئے؟ گاندھی جی نے جواب دیا کہ "پرانے زمانے میں چرخے کے

پیچھے آزادی کا جذبہ کارفرما نہیں تھا اس کا تعلق غلامی سے تھا۔ غریب عورتیں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے کاتتی تھیں یا اس زمانے کی حکومت ان کو چند کوڑیاں دے دیتی تھی۔ ہمیں تو سوچ سمجھ کر سوت کاتنا چاہیئے اور کتائی سے تعلق رکھنے والی چھوٹی چھوٹی سب باتوں کا سائنسی شعور پیدا کرنا چاہیئے بد دلی سے چرخہ گھمانا ایسا ہی بے معنی ہے جیسے کوئی محض عادت کے طور پر مالا جپتا ہے۔ چرخے کا یہ مشینی استعمال ختم کر دینے کے قابل ہے۔"

انھوں نے سوت کاتنے کی تعلیمی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بنیادی تعلیم کے استادوں سے کہا کہ چرخہ خدمت کرنے کا ایک آلہ ہے۔ یہ خیالی یا مٹی کے کام اور پینٹنگ جیسا آسان کام نہیں ہے۔ گاندھی جی نے چرخے کو سورج کے گھیرے سے تشبیہ دی تھی اور ان کا خیال تھا کہ تمام دوسری دستکاریاں اس کے گرد گردش کرتی ہیں۔ انھوں نے استادوں کو یہ بھی بتایا تھا کہ طالب علم کس طرح سوت کے تاروں کو گن کر ریاضی سیکھ سکتے ہیں۔ پھر یہ سمجھا کر کہ پہلی بار کپاس کب اور کس طرح پیدا کی گئی، کس قسم کی مٹی میں یہ پیدا ہوتی ہے اور مختلف ملکوں میں کپاس کی تجارت نے کیسے فروغ پایا: جغرافیہ، تاریخ اور مطالعہ فطرت کی تعلیم بھی دی جا سکتی ہے۔ تکلی چلا کر طالب علم یہ بھی سیکھ سکتا ہے کہ تکلی کی تیلی فولاد سے کیوں بنائی جاتی ہے اور اس کی پٹیل کی چکتی خاص ناپ کی کیوں ہوتی ہے وغیرہ، غرض کسی بھی چیز کا صحیح اصول سمجھایا جا سکتا ہے۔

گاندھی جی نے قومی پیمانے پر اپنی سالگرہ منانے کی اسی وقت اجازت دی جب اس کو چرخہ جینتی کی شکل دی گئی۔ کھادی اور سوت کاتنے کو مقبول بنانے کا کوئی موقع انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا جب وہ کانگریس کے صدر بنے تو انھوں نے کانگریس کی رکنیت کے لئے چار آنے چندہ کی بجائے سوت کی شکل میں

چندہ دینے کا اصول اپنایا اور ہر رکن سے کہا کہ وہ روزانہ کم از کم آدھ گھنٹہ باقاعدگی سے سوت کات کر
مقررہ مقدار میں کھادی بورڈ کو دیتے رہیں۔ اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں انھوں نے چرخہ سنگھ کو یہ
ہدایت کی کہ کھادی وہی لوگ خریدیں جو قیمت کا ایک معمولی حصہ سوت کی شکل میں ادا کریں۔ جب لوگوں نے
شکایت کی کہ وہ سوت نہیں دے سکتے تو گاندھی جی نے کہا کہ اگر لوگ سوت نہیں کاتیں گے تو کھادی کہاں سے
ملے گی؟

ہندوستان میں کپڑے کی قلت کی کسی بات کو گاندھی جی نے تسلیم نہیں کیا۔ انھیں یقین تھا کہ
ہندوستان نے اپنی ضرورت سے زیادہ کپڑا تیار کیا ہے۔ اور یہاں انسانی طاقت بھی زیادہ ہے۔ گھر گھر
میں تکلی اور چرخہ چلا کر کپڑے کی کمی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ سوت کاتنا گاندھی جی کی روحانی ضرورت بنتا
گیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اس طرح غریب سے غریب آدمی کے قریب آ رہے ہیں اور ان کے
ذریعہ خدا کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ "چرخے کی سست رفتاری سے نفرت
کرنے کے لئے مجھے کئی بار جنم لینا ہوگا۔ اگر سب لوگ مجھے چھوڑ دیں یا مجھے قتل کر دیں تو بھی میں چرخہ
نہیں چھوڑوں گا۔"

بنیا

ایک مرتبہ گاندھی جی نے کہا تھا " میں ایک بنیا ہوں اور میرے حرص کی کوئی حد نہیں ہے "۔ وہ ذات کے بنئے ہی تھے ۔ ان کے والد دیوان تھے اور گاندھی جی کو بھی ان کی گدی سنبھالنی تھی لیکن دیوان بننے کے بجائے انھوں نے فقیرانہ زندگی بسر کرنا پسند کی ۔ پھر بھی بنیوں کی کئی فطری خصلت ان میں بڑی حد تک موجود تھی ۔

وہ بڑے کفایت شعار تھے ، اس لئے ان کی نظر سستی ، پائیدار اور خوب صورت چیزوں پر پڑتی تھی ۔ انھوں نے تمام قیمتی اور آرائشی سامان کا استعمال ترک کر دیا اور اپنے ہاتھ کے بنے کھادی کے کپڑے ، موٹی چادر اور ہاتھ کی بنی مضبوط چپل پہننے لگے ۔ وہ اپنی بیوی ، بچوں کو بھی معمولی اور موٹی کھادی کے کپڑے پہناتے تھے ۔ ان کی غذا میں مختلف قسم کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں ۔ وہ ایک سادی روٹیاں ، چاول ، ابلی سبزیاں ، کچے ہرے پتے ، بکری کا دودھ ، گڑ یا شہد ، اور پھل ان کی غذا تھی ۔ وہ ایک دن میں زیادہ سے زیادہ پانچ قسم کی چیزیں کھاتے لگے تھے ۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں غریب آدمی دن بھر میں ایک آنہ کماتا ہے ۔ وہاں زیور اور آرائش پر دولت خرچ کرنا ان کی نظر میں بہت بڑا جرم تھا ۔ چنانچہ ان کی بیوی کے پاس کوئی بھی زیور نہیں تھا ۔

گاندھی جی نے اپنے چاروں بچوں کو کسی مہنگے اسکول یا کالج میں نہیں بھیجا۔ جہاں لاکھوں غریب ہندوستانیوں کی پہنچ نہ تھی، وہ اپنے بچوں کے استاد آپ بن گئے۔ انھوں نے کوئی ملازم نہیں رکھا۔ محنت مشقت کا ہر کام وہ خود کرتے تھے۔ انھوں نے کچی جھونپڑیوں میں رہنا زیادہ پسند کیا۔ انھوں نے کئی بار پورے ہندوستان کا سفر ریل کے تیسرے درجے میں کیا۔ ریل میں کپڑوں کی گٹھری یا کاغذ کے بنڈل کا وہ تکیہ بنا لیتے تھے۔ اُن کے بستر میں بس سوتی کمبل ہوتا تھا اور کھادی کی چادریں۔ ایک مرتبہ انھوں نے مچھر دانی کے بغیر سونے کی کوشش کی۔ رات کو سوتے وقت انھوں نے ایک چادر لپیٹ لی اور منھ پر مٹی کا تیل مل لیا۔ انھوں نے سوچ رکھا تھا کہ غریب کسان یہی کرتے ہیں کیونکہ وہ مچھر دانی نہیں خرید سکتے۔

گاندھی جی اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کہ کیا برطانوی حکمران ہندوستان کو واقعی آزاد کرنے کے خواہش مند ہیں، چوتھی بار جب وہ انگلستان گئے تو انھوں نے جہاز کے عرشے پر سفر کیا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں اور سیکریٹریوں کو بھی کپڑوں سے بھرے صندوق لے جانے سے روک دیا۔ اور ان سے کہا کہ وہ انگلستان میں ہندوستانی لباس — دھوتی، کرتا اور چپل پہنیں۔ اس طویل بحری سفر میں ایک دوست نے گاندھی جی کو سات سو روپے کی ایک قیمتی شال تحفے کے طور پر پیش کی۔ انھوں نے جہاز پر ہی اس شال کو یہ کہتے ہوئے سات ہزار روپے میں فروخت کر دیا کہ "غریبوں کے واحد نمائندے کی حیثیت سے مجھے یہی کرنا چاہیئے۔" گاندھی جی نے کہا تھا کہ اُن کے دوستوں نے جو بے شمار شالیں انھیں دی تھیں ان سے وہ ایک دکان کھول سکتے تھے۔ انھوں نے اس قسم کی تمام رقم ہریجنوں کی بھلائی کے کام میں صرف کی۔

گاندھی جی جب فرانس پہنچے تو فرانسیسی لوگوں کے دل پر انھیں دھوتی میں دیکھ کر ایک چوٹ سی لگی۔ گاندھی جی نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا "آپ اپنے ملک میں PLUS FOURS (گھٹنوں سے نیچا لباس) پہنتے ہیں، میں —— MINUS FOURS (گھٹنوں سے اونچا لباس) پہنتا ہوں۔" کچھ لوگوں کو اب بھی یقین نہ آیا کہ آیا یہ اپنے اس ناکافی لباس میں شہنشاہِ انگلستان سے ملیں گے اور ایک سرد ملک میں خوش پوشاک لوگوں کے درمیان گھومیں گے؟ گاندھی جی نے اپنی آنکھوں میں چمک لاتے ہوئے انھیں یقین دلایا کہ "شہنشاہ اتنے کپڑے پہنتے ہیں جو ہم دونوں کے لئے کافی ہوں گے۔" وہ دھوتی، پیوند لگی شال اور چپل پہن کر گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے، آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں اور بکنگھم پیلس گئے۔ چرچل نے بہت برہم ہو کر انھیں "ہندوستان کا نیم عریاں فقیر" کہا تو گاندھی جی نے اس پر فخر محسوس کیا۔ لندن میں ان کے کھانے کا روزانہ خرچ بارہ آنے سے زیادہ نہیں تھا۔ گاندھی جی کسی بھی چیز کے ضائع کرنے پر سخت برہم ہوا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کپڑے کی کترنیں بیچی جا سکتی ہیں، مسواک کو دھو کر اور سکھا کر ایندھن کے کام میں لانا چاہئے۔ وہ چوبیسوں گھنٹے مختلف قسم کے کاموں میں مصروف رہتے۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے اور کبھی کسی کام کے کرنے میں تاخیر نہ کرتے تھے نہ کسی کام میں وہ جلد بازی سے کام لیتے۔ وہ الفاظ کی کفایت میں بھی یقین رکھتے تھے انھوں نے بہت سی تقریریں کیں اور بے شمار مضامین لکھے مگر بھرتی کے لفظوں سے ہمیشہ گریز کیا۔ وہ ایسے خطوط اور لفافوں کو جن کے دوسری طرف کچھ نہیں لکھا ہوتا تھا رکھ لیتے تھے۔ ان کے پاس ان کاغذوں کے مختلف سائز کے بنڈل رہا کرتے تھے جسے وہ لیٹر پیڈ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

انھوں نے بعض اہم بیانات، مسودے اور وائسرائے، بادشاہ اور برطانوی وزیر اعظم کو ان کے

خطوں کے جوابات ان ہی کاغذ کے پرزوں پر تحریر کئے تھے، ایک مرتبہ ایک چھوٹی سی پنسل، جو ایک بچے نے تحفے میں دی تھی اور ایک جھانواں جو وہ برسوں سے استعمال کر رہے تھے کھو گیا تو انھیں اس وقت تک چین نہ آیا جب تک کافی تلاش کے بعد وہ مل نہ گیا۔ آزادی کے بعد انھوں نے ذاتی خط و کتابت کے لئے سرکاری اسٹیشنری اور چھپے ہوئے قیمتی لیٹر پیڈ استعمال کرنے پر وزیروں اور کونسلروں کو خوب جھاڑا تھا۔ انھوں نے اس بات سے آگاہ کیا کہ انگریزوں کے طور طریقوں اور عادتوں کی تقلید کر کے ہم خود اپنا بھی نقصان کریں گے! در ہندوستان کو بھی تباہی و بربادی کے گڑھے میں ڈھکیل دیں گے۔ انگریز تو رعایا پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتے تھے۔ اس لئے ہمیں اس قسم کی تمام مہنگی عادتوں کو ترک کر دینا چاہیئے۔ ہمیں اردو اور دیوناگری میں چھپے ہوئے ہاتھ کے بنے کاغذ کے معمولی لیٹر پیڈ کا استعمال کرنا چاہیئے۔ عوام کے خادموں کو قیمتی سپاسنامے اور پھولوں کے ہار بھی قبول نہیں کرنے چاہئیں۔

گاندھی جی نے غریبوں کے لئے جو رقم جمع کی تھی وہ اس کی ایک ایک پائی بچانا چاہتے تھے۔ پبلک فنڈ کے لئے جو منی آرڈر، ڈرافٹ اور چیک ملتے تھے وہ ان کی کمیشن فیس بھی بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ والنٹیر اور منتظم اگر پبلک فنڈ سے لاپرواہی کرتے تو وہ انھیں ڈانٹتے، پھٹکارتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں جب گاندھی جی ہندوستان آئے تو انھیں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں نے ایک ہزار روپے دیئے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے اخراجات کا پورا پورا حساب پیش کیا۔ کچھ دلچسپ اندراج یہ تھے: ٹرام پر

ایک آنہ، پانی پر دو پیسے، مداری کو دو پیسے، جادوگر کو ۲ آنے، متفرق چار روپے۔

گاندھی جی اکثر کہا کرتے تھے "ہماری مہم میں فضول خرچی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر مقامی کارکن میرے

لئے بہتر ین پسنگترے اور انگور لایا کریں یا مجھے ضرورت تو ہو ۱۲ کی اور وہ لے آئیں ۱۳۰ ، تو یہ فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے! ہم لاکھوں بے زبان لوگوں کے پیسوں کے امین ہیں۔" انھوں نے اپنی کم عمری کے زمانے میں بھی خود اس پر عمل کیا تھا۔ جنوبی افریقہ میں محض چند روپے بچانے کی خاطر وہ آشرم سے بازار تک پیدل جاکر سامان لایا کرتے تھے اور دفتر یا کچہری بھی روزانہ پیدل ہی آیا جایا کرتے تھے

ایک مرتبہ ان کے لکچر "کیا قوم پرستی کے لئے نسلی عداوت ضروری ہے" کا اہتمام کیا گیا اور اس پر ٹکٹ لگا دیا گیا۔ ٹکٹ سے حاصل کی ہوئی رقم دیش بندھو یادگار فنڈ کو دے دی گئی۔ گاندھی جی نے پہلی بار ایک گراموفون کمپنی میں ایک تقریر "سچائی ہی خدا ہے" ریکارڈ کرائی۔ آدھے گھنٹے کے اندر انھوں نے پینسٹھ ہزار روپے کمائے اور سبھی چندہ فنڈ کو دان کر دیے وہ صرف روپیہ بچانے کے ہی گُر نہیں جانتے تھے بلکہ روپیہ کمانا بھی خوب جانتے تھے۔ حکومت نے جب ان کی کتابوں پر پابندی لگا دی تو انھوں نے کھلم کھلا کچہری لگا کر اپنی کتابیں چھپیں اور "ہند سوراج" کے کچھ نسخے تو انھوں نے پانچ روپے، دس روپے اور پچاس روپے تک میں فروخت کئے جب کہ اس کی اصل قیمت محض چار آنے تھی۔ ڈانڈی یاترا کے زمانے میں انھوں نے جو آدھا تولہ نمک اٹھایا تھا اسے ان کے ایک عقیدت مند نے پانچ سو پچیس روپے میں خریدا۔ اس وقت آدھے تولے سونے کی قیمت چالیس روپے تھی۔ دنیا میں کسی بیوپاری نے اتنی اونچی قیمت پر نمک فروخت نہیں کیا ہوگا۔

انھیں معلوم ہوا کہ لوگ ان کے دستخط لینے کے لئے بہت بے چین رہتے ہیں اس لئے انھوں نے اپنی دستخط کے پانچ روپے مقرر کر دیئے۔ جو لوگ عطیے وغیرہ دیتے تھے ان کو بھی ان کے دستخط کی یہ فیس دینا پڑتی تھی۔ کھادی کی فروخت میں اضافہ کرنے کے لئے ایک بار گاندھی جی نے خود کھادی

فروخت کی۔ اپنے بائیں طرف گزا اور دائیں طرف کھادی رکھ کر وہ بڑی پھرتی سے رسیدوں پر دستخط کرتے رہے۔ اس طرح اکیلے انھوں نے بہت جلدی صرف پندرہ منٹ میں پانچ سو روپے کی کھادی فروخت کر دی ایک دوسرے موقع پر سفر کرتے ہوئے انھوں نے اسٹیشنوں پر کھادی بیچی تھی۔ کھادی کی ایک نمائش میں جس کا افتتاح گاندھی جی کے ہاتھوں ہوا تھا ایک ہفتے میں چار ہزار روپے کی کھادی فروخت ہوئی جب کہ عموماً کھادی کی فروخت سالانہ چھ ہزار روپے سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی۔ ان کی اپیل کی بدولت ایک کھادی بھنڈار کی سالانہ فروخت اڑتالیس ہزار روپے سے بڑھ کر چونسٹھ ہزار تین سو بارہ روپے ہو گئی۔ انھوں نے کانگریس اجلاس میں دستکاریوں کی نمائش میں آنے والے تمام لوگوں سے کہا کہ وہ نمائش کی ان دستکاریوں کو مقبول بنائیں۔

گاندھی جی نے بدیشی سامان کے بائیکاٹ کرنے کی جو تحریک شروع کی تھی اس کی وجہ سے بنگال میں بدیشی کپڑے کی سالانہ فروخت گھٹ کر آدھی رہ گئی۔ دوسرے صوبوں میں بھی یہی کچھ ہوا اور غیر ملکی تجارت دم توڑنے لگی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ یہاں سامان بنا کر درآمد کو بھی ترقی دینا چاہیے۔ اور برطانوی تجارت کو محض اس حد تک بڑھاوا دینا چاہیے جہاں تک وہ ہندوستان کے لئے نقصان دہ نہ ہو۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ گھروں میں تو بدیشی چیزوں کا استعمال کریں اور باہر دکھاوے کے لئے کھادی پہن لیا کریں۔ بڑے بڑے صنعت کاروں اور تاجروں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ سارے ہندوستان کو کھادی پوش بنا دینا چاہتے تھے۔ اور تباہ ہوئی گھریلو صنعت کو از سر نو زندہ کرنا چاہتے تھے۔

انھیں اپنے کاموں کے لئے مخالف بدیشی حکومت سے کسی قسم کی مالی امداد نہیں ملی اور عوام کی

بے رخی سے بھی بڑی دل شکنی ہوئی، پھر بھی انھوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ لوگوں کو بنیادی ضرورتوں کی چیزوں کی تیاری کے لئے خود اپنی محنت اور صلاحیت پر بھروسہ کرنا اور اپنی مدد آپ کرنا سکھائیں گے۔

'کل ہند دیہی صنعتی انجمن' اور 'کل ہند چرخہ سنگھ' قائم ہوئے، ان کی بہت سی شاخیں تمام ہندوستان میں کھل گئیں۔ واردھا کا 'مگن میوزیم' کتائی، بُنائی، کاغذ سازی، چمڑے کے کام، کولھو سے تیل نکالنے، دھان کوٹنے، صابن سازی، شہد کی مکھیاں پالنے، بڑھئی اور درزی کے کاموں کا مرکز بن گیا۔ گاندھی جی بار بار کہتے تھے کہ اپنے گھر کے گیہوں سے گھر میں پکی روٹی جتنی سستی ہوتی ہے اتنی سستی بازار کی روٹی نہیں ہوتی، اسی طرح اپنے ہاتھ کے کتے بنے کپڑے کے مقابلہ میں کوئی اور کپڑا سستا نہیں ہو سکتا۔ اُن کی رائے میں زندگی کی قیمت دولت سے زیادہ ہے۔ بے کار رہنے کی وجہ سے لوگوں میں جو کاہلی پیدا ہو جاتی ہے اس سے ان کو بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ انھوں نے قومی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے ہماری معاشی صلاحیت میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بارہا کہا کہ "کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم باوجود اس کے کہ بے انتہا اناج پیدا کرتے ہیں پھر بھی گیہوں باہر سے منگاتے ہیں؟ ہم پالش کئے ہوئے چاول اور کم غذائیت والی شکر کھاتے ہیں۔ ہم مشین کی پسی کم غذا والی چیزوں پر خرچ کرتے ہیں اور اس کے بدلے بیماری خرید لیتے ہیں۔ ہم نے گاؤں کے تیلیوں کو تباہ کر کے نقصان اٹھایا ہے۔ آج کا گاؤں والا ۵۰ سال پہلے کے گاؤں والوں سے جسم اور تندرستی میں آدھا بھی نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ دیتا ہے پاتا کچھ بھی نہیں۔ میری اسکیم کے تحت شہروں میں ایسی چیزوں کے بننے کی اجازت نہیں ہوگی جو گاؤں میں بخوبی تیار کی جا سکتی ہیں"۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے چاول خود کوٹیں، اپنے گیہوں خود پیسیں، شکر کی بجائے تازہ گڑ استعمال کریں، سوت کاتیں اور کپڑا بُنیں۔ وہ اکثر غیر ملکی مہمانوں کو مجبوراً گڑ چکھایا کرتے تھے

گاندھی جی نے ملک کے لوگوں سے کہا کہ کھادی کارخانوں کے کپڑوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔" کارخانہ دار کی کوشش ہوگی کہ یہ سستی ہو جائے لیکن ہمیں انصاف اور مناسب اُجرت دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ ایک طرح کا غیر شعوری ظلم ہوگا۔" کاغذ کا ایک کارخانہ دار مزدوروں کو چھ پیسے یومیہ دیتا تھا اور زیادہ سے زیادہ سستا کاغذ بنانے کی اُمید رکھتا تھا۔ گاندھی جی نے اس سے کہا کہ وہ کاغذ کو کم شرح پر ہرگز نہیں خریدیں گے۔

کسانوں اور گاؤں کے لوگوں کو تباہ کر کے جو لوگ روزی کماتے ہیں گاندھی جی ان کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ زمین جوتنے والا اپنے کام کی پوری اُجرت نہیں پاتا۔ پوری قیمت کا بہت کم حصہ اُس کو ملتا ہے۔ ان کی پریشانی کا سبب قیمتوں کی کمی نہیں تھی بلکہ دلال مصیبت بنے ہوئے تھے۔ وہ اناج اور کپڑے پر کنٹرول کے خلاف تھے اور کالے بازاری اور بنیوں کی حد سے بڑھی منافع خوری پر لعنت ملامت کرتے تھے۔ انھوں نے ان بڑے تاجروں کو بھی بُرا بھلا کہا جو دھوکا دیکر دولت جمع کرتے ہیں اور اپنے تئیں اس مغالطے میں رکھتے تھے کہ دھرم کرم اور دان پُن کرنے سے ان کے گناہ دُھل جائیں گے۔ انھوں نے بیوپاریوں کو بھی پھٹکارا اور کہا "بڑے بڑے تاجر اور سرمایہ دار برطانوی حکومت کے خلاف کہتے رہتے ہیں مگر عملی طور پر کرتے اُسی کی مرضی کے مطابق ہیں اس طرح انھیں محض پانچ فی صدی نفع حاصل ہوتا ہے، جبکہ حکومت کو پچانوے فی صدی نفع حاصل ہوتا ہے۔ سودیشی تحریک کو بڑی حد تک ہندوستانی تاجروں نے نقصان پہنچایا، جنھوں نے سودیشی کے نام پر غیر ملکی چیزوں کو بیچا۔ تاجروں کی وجہ سے ہندوستان غلام ہوا، اور مجھے یقین ہے کہ اس نقصان کی تلافی بھی انھیں کے ذریعے ہوگی۔"

کسان

گاندھی جی نے ایک نظم پڑھی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ کسان ہی دُنیا کا اَن داتا ہے۔ خدا دینے والا ہے اور کسان اس کا ہاتھ ہے۔ گاندھی جی بڑے دعوے سے کہا کرتے تھے کہ کسانوں کو غربت اور جہالت سے نجات ملنے پر ہی ہندوستان کی آزادی کا انحصار ہے۔ آبادی کا چھیاسی فی صدی سے زیادہ حصہ زراعت پیشہ ہے۔ "وہی اس زمین کو ہرا بھرا بنائے ہوئے ہے۔ زمین کا اصلی مالک کسان ہی ہے نہ کہ وہ زمیندار جو ہمیشہ کھیتوں سے دُور رہتا ہے۔" سب ہی بھومی گوپال کی" اگر ہم کسانوں کی محنت کا سارا پھل اُن سے چھین لیں تو عوام کی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ ملک کو سچی آزادی وکیل، ڈاکٹر یا بڑے بڑے زمیندار نہیں دلا سکتے، وہ تو کسانوں کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔"

ریاستی محصول کا پچیس فی صدی کسانوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ ان پر زمین ٹیکس کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ ہندوستان کے کسی شہر میں کہیں کوئی عالی شان عمارت بن رہی ہوتی تو اس کی خبر سن کر یا اسے دیکھ کر وہ بڑے دُکھ کے ساتھ کہا کرتے کہ "ہائے افسوس، یہ وہ روپیہ ہے، جو کاشت کاروں سے حاصل ہوتا ہے۔" شہری خوش حالی کی ایسی کوئی علامت گاندھی جی کو کاشت کاروں پر لگے ٹیکس کے بوجھ، ناجائز مطالبوں، کمر توڑ قرض، جہالت، وہم پرستی اور ان

کے دکھوں کی یاد دلاتی تھی۔

گاندھی جی نے کسان کے گھر میں جنم نہیں لیا تھا لیکن وہ کسان بننے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ بچپن سے انھیں پھل دار درخت لگانے کا بڑا شوق تھا۔ اسکول سے واپس آکر روزانہ دوپہر بعد بالٹیاں بھر بھر کر دہ چھت پر رکھے پودوں کو پانی دیا کرتے تھے۔ چھتیس برس کی عمر میں انھوں نے کھیتی باڑی شروع کی اور کسانوں کی طرح رہنا شروع کیا۔ فارم بنانے کے لئے جب وہ ایک قطعۂ زمین کی تلاش میں تھے تو انھوں نے ایک ایکڑ زمین جس میں کچھ پھل دار درخت تھے بہت پسند آیا وہ قطعۂ زمین انھوں نے خرید لیا۔ اور اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ وہاں رہنے لگے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے وکالت کی اچھی خاصی کمائی کا پیشہ چھوڑ دیا۔ اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ فارم کے رہنے والوں نے خود جھونپڑیاں بنائیں۔ گاندھی جی نے زمین کا جو تی اور کھدائی کی سبزیاں اور پھل لگائے اور لکڑیاں کاٹیں اور اس قطعۂ زمین کو چمن زار بنا دیا۔

جنوبی افریقہ میں دس سال کی دیہاتی زندگی کے دوران انھیں کھیتی باڑی کا کافی تجربہ ہوا اور ان کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ انھوں نے شہد کی مکھیاں پالنے کا ایک ایسا سائنسی اور اہنسک طریقہ رائج کیا جس سے نہ تو چھتہ خراب ہو اور نہ مکھیوں کو نقصان پہنچے۔ گاندھی جی نے بتایا کہ انھوں نے کھیتوں اور باغ کے قریب شہد کی مکھیاں پال کر پودوں سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ شہد کی مکھیاں پھولوں سے جب شہد حاصل کرتی ہیں تو اپنے پیروں میں زر دانے لے کر اڑتی ہیں۔ اور اس طرح فصل بہتر اور زیادہ ہوتی ہے۔

بنجر زمین یا درختوں کی قلت اور ناکافی پانی کی کسی شکایت کو وہ نہیں سنتے تھے۔ اُن کا قول

تھا کہ کسان کی سچی دولت اس کی محنت کا صحیح استعمال ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ کسان باہمت اور صلاحیت ہو اور اپنے اوپر بھروسہ کرے۔ نئی تعلیم کے ایک منتظم نے جب ان سے شکایت کی کہ ان کی زمین کھیتی باڑی کے لائق نہیں ہے۔ تو گاندھی جی بولے کہ "جنوبی افریقہ میں جس زمین پر ہم نے کھیتی شروع کی تھی اس کا تمہیں علم نہیں ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں پہلے ہل چلانے کی بجائے بچوں کو کدال دے کر اس کا استعمال سکھاتا کہ یہ بھی ایک فن ہے۔ بعد میں ہل چلواتا۔ کمپوسٹ یا نباتاتی کھاد کی ایک باریک تہہ سے ہم بہت سی سبزیاں اور موسمی پودے اُگا سکتے ہیں۔ کم گہری نالیوں میں فضلے کی کھاد تیار کرنے کے لئے پندرہ دن سے زیادہ نہیں لگتے۔

ہمیں اپنے بچوں کو یہ کام سکھانا چاہیئے تاکہ وہ اس کام کو ایک باعزت کام سمجھیں۔ یہ حقیر نہیں بلکہ شریفانہ پیشہ ہے۔" گاندھی جی کا خیال تھا کہ زراعت ان کی بنیادی تعلیم میں ایک اہم حصہ لے سکتی ہے۔

ہندوستان کے بٹوارے سے کچھ دن پہلے نواکھالی کے ہندوؤں نے ان سے شکایت کی کہ "ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں؟ یہاں رہ کر ہم کھائیں گے کیا؟ مسلمان کسان ہماری مدد نہیں کرتے اور نہ ہمیں ہل بیل مہیا کرتے ہیں۔" گاندھی جی نے فوراً جواب دیا "تم کدالیں اور پھاوڑے لے کر زمین کھودو۔ کدال سے کھدی ہوئی زمین میں بھی فصل کم نہیں ہوگی۔"

۱۹۴۳ء میں جب گاندھی جی جیل میں تھے، لاکھوں آدمی بنگال کے قحط سے مر گئے۔ اس افسوس ناک واقعہ کی یاد لوگوں اور حکومت کے افسروں کے ذہنوں میں تازہ تھی، ۱۹۴۷ء میں دوبارہ قحط پڑنے کا خطرہ دکھائی دیتے ہی وائسرائے نے فوراً اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کو ہوائی

جہاز سے گاندھی جی کا مشورہ حاصل کرنے کے لئے سیواگرام بھیجا۔ گاندھی جی نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے لوگوں کو آنے والی مصیبت سے خوف زدہ نہ ہونے کا مشورہ دیا اور کہا کہ "ہمارے ملک میں زرخیز زمین بہت ہے، پانی بھی کافی ہے۔ اور انسانی طاقت کی بھی کمی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں قحط کے کیا معنی؟ لوگوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ جو دو دانے کھاتا ہے وہ چار دانے اگائے۔ ہر شخص اپنے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ پیدا کرے۔ اس کے لئے آسان سا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑی سی صاف مٹی میں کیمیاوی کھاد ملا کر اور کسی ٹین یا مٹی کے برتن میں بھر کر سبزی کے بیج ڈال دیں۔ اور روزانہ پانی دیتے رہیں۔ دعوتیں ختم کر دی جائیں۔ اناج کی ساری برآمد روک دی جائے۔ گاجر، آلو، رتالو اور کیلے جیسی جڑوں سے مانڈی نکالی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی غذا میں سے اناج اور دالیں چھوڑ کر اناج کی بچت کی جا سکتی ہے۔" ان کے نعرے "اپنی مدد آپ کرو" کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ کچھ پابندیوں پر سختی سے عمل کیا جائے۔ اپنے کھانے کی عادت بدلی جائے اور باہر کے ملکوں سے بھیک نہ مانگی جائے۔

کھانے اور کپڑے پر کنٹرول کے دوران گاندھی جی کو حکومت سے راشن لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ بغیر چاول، گیہوں اور دالوں کے گزر کرنے لگے۔ اور شکر کا استعمال بھی ترک کر دیا۔ انھوں نے اپنے لئے کپڑا بھی خود تیار کیا۔

اپنے اخبار ہریجن میں انھوں نے کمپوسٹ کھاد بنانے کی مفصل ہدایتیں دیں کہ بغیر کچھ خرچ کئے آسانی سے دستیاب ہو جانے والی چیزوں مثلاً گوبر، فضلے، پیشاب، سبزیوں کے چھلکے اور سڑے ہوئے آبی پودوں سے کس طرح کمپوسٹ کھاد تیار کی جا سکتی ہے۔ کمپوسٹ کھاد

پیسے کے بغیر محنت اور مختلف طریقوں سے کام لیکر تیار کی جا سکتی ہے۔ ان کے آشرم میں پاخانے اور پیشاب کو کم گہرے گڑھوں میں بھر دیا جاتا تھا۔ اس لئے ایک فٹ کی گہرائی تک زمین میں جراثیم بھر جاتے ہیں جو فضلے کو کھاد میں تبدیل کر دیتے ہیں، زیادہ گہرا دبا ہوا فضلہ زہریلی گیس پیدا کرتا ہے اور ہوا کو گندہ کرتا ہے۔ اس طرح کچھ ہی دنوں میں فضلے سے کھاد تیار ہو جاتی ہے۔ بھنگی اور کسان کا یہ ملا جلا کام پرانے خیال کے کسانوں کو پسند نہیں آیا۔ گاندھی جی کیمیاوی کھاد کے مقابلہ میں گوبر اور کوڑے کی کھاد کو زیادہ پسند کرتے تھے، ان کو خطرہ تھا کہ کیمیاوی کھاد سے آخر میں زمین کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین ڈرامائی انداز میں فصلیں دینے کے بجائے فصل پیدا کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔

وہ ہل بیل کے بجائے ٹریکٹروں کے استعمال کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ سابرمتی آشرم میں انھوں نے ہر قسم کے جدید ہل استعمال کر کے دیکھے لیکن بیلوں والا پرانا ہل ہی انھیں زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ اس سے جتائی کرتے سے مٹی کی کھدائی زیادہ گہری نہیں ہوتی، ضرورت کے مطابق کھدائی ہو جاتی ہے۔ انھیں ٹریکٹر اس لئے بھی ناپسند تھے کہ ایک ٹریکٹر سے سینکڑوں آدمی بے کار ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو مفید کاموں میں لگانا چاہتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ مشین کے استعمال سے کسانوں کی تخلیقی صلاحیت گھٹ جائے گی۔ گاندھی جی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے بٹوارے کے صدیوں پرانے طریقے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، کیوں کہ زمین کے سو ٹکڑے کر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کھیتی کرنے کے بجائے سو کسانوں کا مل کر کاشت کرنا اور آپس میں آمدنی بانٹ لینا زیادہ بہتر ہے۔ ہر کسان الگ الگ ہل بیل گاڑی رکھے یہ بھی فضول خرچی ہے۔"

انھوں نے کوآپریٹیو طریقے پر کھیتی کرنے کا پرچار کیا۔ کوآپریٹیو کھیتی کے ذریعے جانوروں کا اچھی طرح سے علاج بھی ممکن ہے اور مشترک چراگاہیں بھی ہو سکتی ہیں اور اچھے صحت مند سانڈ بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ کسی معمولی کسان کے لئے تنہا یہ ساری چیزیں جٹا کر ممکن نہیں۔ جانوروں سے اکثر فائدہ کم ہوتا ہے۔ اور انھیں کھلانا پلانا زیادہ پڑتا ہے۔ جیسے جیسے جانوروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے کسان غربت کی وجہ سے بچھڑا دینے والی گائے بیچ دیتے ہیں یا بچھڑوں کو مار ڈالتے ہیں یا پھر بھوکا مر جانے کے لئے نکال باہر کرتے ہیں۔ جانوروں پر ظلم کرتے اور ان سے بڑی بے رحمی سے کام لیتے ہیں۔

گاندھی جی نے گئو رکھشا پر خصوصی زور دیا۔ کیوں کہ گائے کھیتی باڑی کے لئے بہت مفید جانور ہے انھوں نے ہندوستان کے ہر حصے کے سفر کئے۔ اور ہر سفر میں کسانوں کی بے نور آنکھیں اور گایوں کی بہت بری حالت دیکھ کر انھیں بڑا دکھ ہوا۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی گائے اور اس کی نسل کے ساتھ اتنا برا برتاؤ نہیں ہوتا جتنا ہندوستان میں ہوتا ہے جہاں گئے کی پوجا ہوتی ہے۔ آج کل گائے کی خدمت کا مطلب صرف یہ رہ گیا ہے کہ گئو رکھشا کے پرانے اور مردہ سوال پر مسلمانوں سے جھگڑا کیا جائے اور گائے کو احترام سے چھو لیا جائے۔ آج کل پنجراپول اور گئو شالائیں زیادہ تر ظلم اور اذیت کے باڑے بنے ہوئے ہیں۔ پنجراپولوں میں تندرست اور دودھ نہ دینے والے جانوروں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جہاں سے جانوروں کی افزائش نسل کے لئے مشورے بھی مل سکیں۔ گاندھی جی بھینس کے دودھ اور مکھن کے مقابلے میں گائے کے دودھ اور مکھن کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد گائے کی کھال، ہڈی، آلائش اور گوشت وغیرہ کام میں آ سکتی ہیں۔

گاندھی جی آشرم میں اپنے اچھے قسم کے بیل رکھتے تھے۔ اور انھوں نے ایک نمونے کا گئو شالہ

بنایا تھا۔ گئوشالہ کے چھوٹے بڑے کام بھی وہی کرتے تھے۔ تمام بچھڑوں، بچھیوں کو وہ بڑے پیار سے
تھپتھپاتے۔ ایک بچھڑا کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا تھا۔ کوئی دوا فائدہ نہیں کر رہی تھی۔ گاندھی جی نے
اسے ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور جب ڈاکٹر نے اسے ٹیکا دیا تو انھوں نے خود بچھڑے کا ایک پیر پکڑ لیا
اہنسا کے پجاری کے اس غیر اہنسائی فعل پر بڑی لے دے ہوئی۔ ایک جینی نے دھمکی دی کہ گاندھی جی
کے خون ہی سے یہ پاپ دھویا جائے گا۔ مگر گاندھی جی نے خاموش رہ کر اس طوفان کا مقابلہ کیا۔

ایک بار اور انھیں اہنسا کے ماننے والوں کے کٹر پن پر دکھ ہوا تھا۔ جب وہ ان بندروں کو
مار دینے پر راضی ہو گئے تھے جو آشرم میں بوئی ہوئی سبزیوں، پھلوں اور فصلوں کو برباد کر دیتے
تھے۔ انھوں نے کہا "ایک کسان بن جانے کے بعد مجھے ایسے طریقے تلاش کرنے ہوں گے جن کے ذریعے
برائے نام تشدد کر کے فصلوں کو ان بندروں سے بچایا جا سکتا ہے۔ بندر جان کے لئے ایک مصیبت
بن گئے ہیں۔ بندوق کی گولیوں تک سے نہیں ڈرتے۔ بلکہ گولیوں کی آواز پر چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ اگر کوئی اور
ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تو میں انھیں مارنے کے مسئلے پر بھی غور کروں گا۔" لیکن آشرم میں کسی بندر کو مارنے
کی نوبت نہیں آئی۔

گاندھی جی کو ہمیشہ یہ فکر رہی کہ غریب کسانوں کی آمدنی میں کس طرح اضافہ کیا جائے۔ یہ لوگ سال میں
چار چھ مہینے بے کار رہتے ہیں۔ اور صرف کھیتی باڑی پر گزارا نہیں کر پاتے۔ گاندھی جی نے تیس کروڑ
کسانوں کی اس بے کاری کو دور کرنے کے لئے عورتوں سے چرخہ چلانے اور مردوں سے کرگھے پر بنائی کرنے
کے لئے کہا۔ وہ ان جاہل بھوکے ننگے کسانوں کی آمدنی اس حد تک بڑھانا چاہتے تھے کہ وہ اپنی غذا، کپڑے
مکان، تعلیم کا معقول بندوبست کر سکیں۔ انھیں زندہ رہنے کا علم بھی کرنا ہوگا۔ انھوں نے کسان مزدور

پورن سوراج کے لئے آواز بلند کی۔ اور کہا کہ "کسان کو جب اپنی اس حالت کا اندازہ ہوگا اور اسے یہ معلوم ہوگا کہ اس کی بربادی کا سبب اس کی قسمت نہیں ہے تب وہ قانونی اور غیر قانونی ذریعوں کا سارا فرق بھول جائے گا۔ جب ہندوستانی کسان یہ سمجھ لے گا کہ سوراج کیا ہے تو کسی میں اتنی ہمت نہ ہوگی کہ وہ اس سے اس کی آزادی چھین سکے۔"

گاندھی جی کی رہنمائی میں کسان سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوتے، سرکاری پابندیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نمک بنایا اور عام جلسوں میں آزادی حاصل کرنے کا عہد کیا۔ لگان بندی کی تحریک میں شریک ہونے کی وجہ سے ان کی جائیداد اور زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ اس طرح انھیں مالی نقصان تو ہوا لیکن ان کا اخلاقی رتبہ بہت بڑھ گیا۔

نیلامیا

گاندھی جی چاہتے تھے کہ کوئی ایسا قانون بن جائے جس کے تحت "مہاتما" کہنا یا ان کے پیر چھونا جرم قرار پا جائے لیکن دیہاتوں اور شہروں میں ان کا جو زبردست اور شاندار استقبال کیا جاتا تھا اسے روکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ وہ مختلف کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے جگہ جگہ گئے۔ اور ہر جگہ انھوں نے عام لوگوں سے رابطہ قائم رکھا۔ وہ جہاں بھی گئے بے انتہا محبت اور عقیدت سے ان کا استقبال کیا گیا۔ انھیں گلدستوں، ہاروں، جزادانوں اور مٹی و تانبے کے سپاسناموں، روپے، پیسوں اور زیوروں کے عطیے دیے گئے۔ گاندھی جی محبت کے اس اظہار کو تو ضرور پسند کرتے تھے لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں ایک شخص کی اوسط آمدنی تین پیسے یومیہ ہو وہاں ہاروں، جھنڈوں، سپاسناموں پر پیسہ برباد کرنا انھیں پسند نہیں تھا۔

گاندھی جی لوگوں سے درخواست کرتے تھے کہ وہ فضول خرچی نہ کریں لیکن لوگ سنتے ہی نہیں تھے آخر انھیں ایک ترکیب سوجھی کہ لوگوں کی اس فضول خرچی سے فائدہ اٹھا کر پیسہ جمع کیا جائے اور پھر پیسہ دینے والوں کی تشہیر کی جائے۔ اس لیے انھوں نے تمام تحفوں کو نیلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ عام جلسوں میں اسٹیج پر سے وہ کہا کرتے "میری پیاری پیاری چھوٹی بچیاں تو یہاں ہیں نہیں اب میں یہ ہار کس کو دوں؟ کیا کوئی انھیں خریدے گا؟" "دو روپے ایک" "تین روپے، پانچ روپے" "دو روپے، تین روپے

پانچ روپے۔ وہ رُک رُک کر بڑے مزے لے کر کہتے۔ سنگترہ یا پھولوں کے ہار جیسی معمولی شے کو حاصل کرنے کے لئے لوگ نیلام کے دام بڑھاتے جاتے تھے۔ ایک ہار کبھی تیس روپے میں اور کبھی تین سو روپے میں بکتا تھا۔ گاؤں والے بھی بولی بولنے میں پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ گاندھی جی نے ایک صندوقچہ لے کر کہا "اس کی قیمت ڈھائی سو روپے ہے۔ نہیں نہیں میں نے غلط کہا اس کی قیمت پچھتر روپے ہے" جب اس کے تین سو روپے لگائے گئے تو وہ بولے "تین سو روپے، تین سو روپے، آگے بڑھو میں اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔ مجھے پہلا ایک صندوقچے کے ایک ہزار روپے مل چکے ہیں"۔ کلکتے کے لوگوں نے تین موقعوں پر انھیں بہت خوبصورت اور قیمتی صندوقچے میں سپاسنامے پیش کئے اور گاندھی جی نے یہ سب نیلام کر دیئے۔ ان کا کہنا تھا "آپ یہ نہ خیال کیجئے گا کہ چیزوں کو نیلام کر کے میں ان کی محبت کی ناقدری کرتا ہوں۔ میں ان صندوقچوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا کیوں کہ ان کو رکھنے کے لئے میرے پاس نہ تو کوئی گھر ہے اور نہ آشرم میں کوئی جگہ۔ مجھے ان چیزوں کو نیلام کر دینے میں کوئی برائی بھی نظر نہیں آتی۔ اس طرح ایک نیک مقصد کے لئے لوگوں میں ایک صحت مند مقابلے اور فیاضی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اسے بھی یاد رکھئے کہ لوگ محض مجھے خوش کرنے کے لئے اتنی اونچی بولی نہیں لگاتے"۔

ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ ان کے نیلام پر بولی اونچی نہ چڑھی ہو۔ انھوں نے ایک سنگترہ دس روپے میں، ایک سوتی ہار دو سو ایک روپے میں، سونے کی ایک تکلی پانچ ہزار روپے میں اور ایک صندوقچہ ایک ہزار روپے میں نیلام کیا۔ ایک ادارے کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے انھوں نے کرنی اور تسلا ایک ہزار روپے میں نیلام کیا۔ ایک مرتبہ نیلام کرتے کرتے گاندھی جی نے ایک چھوٹے بچے کی طرف ہاتھ بڑھایا بچہ گلے میں سونے کا تعویذ پہنے ہوئے تھا۔ بچے کی ماں نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور گاندھی جی نے شفقت

سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اس کا تعویذ اتار کر نیلام کر دیا۔

انھوں نے ایک بار اعلان کیا کہ "میرے پاس بہت سی انگوٹھیاں موجود ہیں۔ میں انھیں بیچنا چاہتا ہوں" ایک انگوٹھی تین مرتبہ نیلام کرنے پر چار سو پینتالیس روپے میں بک گئی۔ اس انگوٹھی کی قیمت اس وقت محض تیس روپے تھی۔ ایک بار بچے ہوئے نوٹوں، چاندی اور تانبے کے سکوں میں ایک کوڑی بھی ملی۔ گاندھی جی بہت خوش ہوئے اور کہا "غریب کے پاس دینے کے لئے شاندار کچھ نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ دے ڈالا۔ قربانی کی یہ نشانی سونے سے زیادہ قیمتی ہے" واقعی وہ کوڑی سونے کی کوڑی سے بھی زیادہ قیمتی ثابت ہوئی۔ بولی بولنے والے ایک شخص نے اسے ایک سو گیارہ روپے میں خرید لیا۔

گاندھی جی کی نیلامی کی عادت اور خوش مزاجی کے چشمے بڑے بڑے جلسوں اور ان سفر کی مشکلوں اور تھکان سے بھی نہیں سوکھے جن میں مصروفیت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اٹھتر سال کی عمر میں، ہندو مسلمانوں کے جھگڑے اور فرقہ وارانہ فسادوں نے ان کی کمر جھکا دی تھی لیکن وہ بہار گئے فساد زدہ مسلمانوں کے لئے فنڈ جمع کیا۔ اور جو زیور انھیں تحفوں میں ملے تھے انہیں نیلام کر دیا۔

گاندھی جی کے پاس نہ دولت تھی اور نہ جائیداد وہ تو بس آشرم میں رہنے والے ایک غریب انسان تھے۔ ایک مرتبہ ایک پبلک فنڈ میں دو تانبے کا ایک پیسہ کے دو ے پائے تھے۔ اس پیسے کو گاندھی جی کے ایک عقیدت مند نے پانچ سو روپے میں خریدا۔ اور ایک قیمتی یادگار کی شکل میں اپنے پاس رکھ لیا۔

بھکاری

گاندھی جی رفاہِ عام کے کاموں میں بہت زیادہ مصروف رہے۔ اور اپنے خاندان اور وکالت کے کاموں پر زیادہ وقت اور توجّہ نہ دے سکے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اگر انھیں عوام کی خدمت کرنا ہے تو انھیں آرام و آسائش، دولت اور جائیداد وغیرہ سے قطع تعلق کر کے فقیرانہ زندگی بسر کرنا ہوگی۔ ایک وقت ایسا آیا جب جائیداد اور لگان انھیں ایک جرم معلوم ہوا۔ اور اس سے کنارہ کش ہو جانے میں انھیں حقیقی مسرت حاصل ہوئی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ان تمام چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انھوں نے اپنی موروثی جائیداد کے لئے بھی کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا اور اپنی زندگی کا جو بیمہ کرایا تھا اسے بھی ختم کر دینے کی اجازت دے دی۔ جس وکالت سے انھیں چار ہزار روپے ماہانہ حاصل ہوتے تھے اسے انھوں نے چھوڑ دیا۔ انھوں نے فینکس آشرم جس کی قیمت پینسٹھ ہزار روپے تھی اور جنوبی افریقہ کے دوستوں سے تحفوں میں ملی چاندی سونے اور جواہرات کی چیزوں سے رفاہِ عام کے لئے ایک وقف بنا دیا۔ انھوں نے نہ صرف خود پر شکوہ اور با اطمینان زندگی گذارنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی بیوی، بچوں اور عزیزوں پر بھی اتنی ہی سختی برتی۔

ان کے دوست اور عقیدت مند جو کچھ ان کی نذر کرتے اسی میں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری چالیس سال گزارے۔ ٹالسٹائی فارم میں گاندھی جی اور ان کے خاندان کے تمام مصارف ان کے عزیز دوست کیلن باخ اٹھاتے تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے سارے آشرم ان کے ہمدردوں اور دوستوں کی مدد

سے چلتے تھے۔

پنڈت مدن موہن مالویہ کو فقیروں کا راجہ کہا جاتا تھا۔ گاندھی جی فقیروں کے بادشاہ تھے۔
رفاہ عام کے لئے بھیک مانگنے میں گاندھی جی نے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ انھیں اپنی اس صلاحیت
کا پتہ جنوبی افریقہ میں چلا تھا جہاں انھوں نے نٹال انڈین کانگریس کے ممبروں سے چندہ جمع کرنے
کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ ایک شام کو وہ ذرا دیر سے ایک مالدار شخص کے پاس گئے اور اس سے
اسّی روپے چندہ مانگا۔ لیکن اسے آمادہ کرنے کی ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں اور وہ چالیس روپے
سے زیادہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ گاندھی جی بھوک اور تکان کے باوجود ساری رات جمے بیٹھے
رہے اور صبح اسّی روپے لے کر اٹھے۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانی باشندوں کی ستیہ گرہ تحریک کے دوران پانچ ہزار ستیہ گرہی لوگوں اور
ان کے خاندانوں کی امداد کے لئے فنڈ جمع کرنے میں اصل ہاتھ گاندھی جی کا تھا ان پر تین ہزار اوسط
روپے روزانہ خرچ ہوتا تھا۔ گاندھی جی نے بحری تار کے ذریعے ہندوستان کے لوگوں سے جو اپیل کی تھی
اس کے جواب میں بڑی فیاضی سے لوگوں نے مدد کی۔ راجاؤں اور مالدار تاجروں نے روپے پیسے
بھیجے۔ کانگریس کے ایک اجلاس میں گاندھی جی کی اس تحریک کے لئے مدد مانگی گئی تو لوگوں نے سونے
چاندی اور نوٹوں کی بارش کر دی۔ گاندھی جی کو جتنے تحفے اور عطیے ملے اس کی انھوں نے رسید بھیجی اور
خرچ کا پورا پورا حساب بھی دیا۔ وہ دان دینے والوں کے احساس کی قدر کرتے تھے۔ خیراتی کاموں
کے لئے جو روپیہ ملتا تھا اسے ان کی مرضی کے خلاف دوسری مدوں پر خرچ نہیں کرتے تھے۔
وہ عوامی سرمائے کو خرچ کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ تلک سوراج فنڈ کے لئے انھوں نے

تین مہینے کے اندر ایک کروڑ روپے جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا، ان کے ایک دوست نے ان سے درخواست کی تھی کہ اگر وہ صرف دس منٹ کے لئے ایک ڈرامے میں شریک ہوجائیں تو اس رات ڈرامے کے اداکار پچاس ہزار روپے جمع کرسکتے ہیں لیکن گاندھی جی راضی نہیں ہوئے، پھر بھی ایک کروڑ پندرہ لاکھ روپے جمع ہوگئے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "امیروں کے ہزاروں روپوں کی میں قدر کرتا ہوں لیکن غریبوں کا دیا ہوا ایک روپیہ یا تانبے کے چند سکے ہر کام کو مقدس بنادیتے ہیں۔ سوراج کے لئے سوچ سمجھ کر دیا ہوا ایک ایک پیسہ دینے والے کے عزم کی علامت ہے۔" غریب بوڑھے جب مضبوط بندھے ہوئے پیسوں کو نکالنے کے لئے کانپتی انگلیوں سے گرہ کھولتے تھے تو یہ منظر گاندھی جی کبھی نہیں بھول پاتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ اپنی ساری پونجی گاندھی جی کے حوالے کردیں۔ ان کے اس جذبے سے گاندھی جی بہت متاثر ہوتے تھے۔ تلک سوراج فنڈ کے ساتھ ساتھ گاندھی جی نے شہیدِ پنجاب لالہ لاجپت رائے، گوکھلے، دیش بندھو داس، اندر دیو اور جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کے لئے یادگار فنڈ قائم کئے۔ انھوں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ اگر جلیان والا باغ کی یادگار بنانے کے لئے معقول رقم مقررہ وقت میں اکٹھا نہ ہوئی تو میں اپنا آشرم بیچ دوں گا اور سب کچھ دے ڈالوں گا۔ دو مہینے کے اندر دیش بندھو میموریل فنڈ کے لئے دس لاکھ روپے جمع ہوگئے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ ٹیگور شانتی نکیتن کے لئے اپنے ڈراموں کے ذریعہ روپیہ جمع کرنے ہندوستان کے سفر پر نکلے ہیں تو انھوں نے عمر رسیدہ شاعر کو اس طرح کی تکلیف اٹھانے سے روک دیا۔ اور انھیں پہلی قسط کے طور پر پچاس ہزار روپے چندہ کے طور پر پیش کئے۔

جب کبھی سیلاب، قحط اور زلزلوں سے تباہی آجاتی تو وہ ہاتھ میں بھیک مانگنے نکل پڑتے تھے

انھوں نے کھادی کے پرچار اور چھوت چھات کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے تمام ہندوستان کے طوفانی دورے کئے۔ ہریجن فنڈ کے لئے انھوں نے دو کروڑ روپے سے بھی زیادہ جمع کیا انھیں اگر صرف ضرورت مندوں کو کھانا کھلانے کے لئے روپیہ دیا جاتا تو وہ ایسا روپیہ لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان محض روٹی کے ٹکڑوں کا بھوکا نہیں ہوتا بلکہ ایک باعزت انسان کی طرح اچھی زندگی گزارنے کا بھوکا ہوتا ہے۔ "ننگوں کو کپڑے دے کر اُن کی بے عزتی کرنا میں قبول نہیں کر سکتا۔ ہمیں بھوکے ننگوں کو کام دینا چاہیئے جس کی انھیں سخت ضرورت ہے۔ انھیں روٹی کپڑا دے کر میں ان کی بے عزتی کرنا نہیں چاہتا۔"

جیل کے ایک ڈاکٹر نے ایک موقع پر اُن سے پُوچھا "گاندھی جی، کیا آپ کے خیال میں صحت مند لوگوں کو گداگری سے روکنا نہیں چاہیئے؟ اس کی روک تھام کے لئے آپ کیا کوئی قانون بنائیں گے؟" گاندھی جی نے جواب دیا "یقیناً، لیکن مجھ جیسے لوگوں کو بھیک مانگنے کی آزادی ہوگی"۔ کہاوت ہے کہ بھیک میں تکرار نہیں چلتی۔ لیکن گاندھی جی نے اس کہاوت کو غلط ثابت کر دکھایا۔ ان کے غریب دان دینے والوں کے پاس ان کا جانا اور دان لینے کے لئے ان کی شرطیں انوکھی تھیں۔ ریل میں، پلیٹ فارم پر یا چلتی ہوئی کار میں کھڑے ہو کر وہ اپنی جھولی لوگوں کے سامنے پھیلا دیتے تھے عموماً ان کو بھیک دینے والوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ سینکڑوں دیہاتی، ضعیف اور بوڑھے مرد عورتیں ان کو اپنا حقیر لیکن خلوص سے بھرا ہوا نذرانہ دینے میلوں پیدل چل کر آتے تھے۔ ان کے نذرانے بھی عجیب و غریب قسم کے ہوتے تھے۔ کچھ لوگ بینگن اور کدو لاتے اور کچھ دوسری چیزیں لاتے تھے۔ نمونے کے ایک آدھ اسکول کے طالب علموں نے انھیں ہاتھ کا کتا ہوا بہت سا سوت

اپنے ہاتھوں سے بُنا ہوا کھادی کا ایک ٹکڑا اور کچھ روپیہ دیا۔ یہ روپیہ انھوں نے کچھ دنوں گھی، دودھ اور گیہوں نہ کھا کر بچایا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عورت نے دو آنے قرض لے کر گاندھی جی کو دیئے اس سے پوچھا گیا کہ "تم نے صرف دو آنے ہی کیوں دیئے؟" اس نے جواب دیا "میں نے یہ دو آنے بطور امداد کے نہیں دیئے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے اس خواب کو پورا کرنے کیلئے دیئے ہیں کہ اس مہاتما کو بھیک دوں جو خود اپنی تمام چیزوں سے دست بردار ہو گیا ہے۔"

گاندھی جی کے لئے چند لاکھ روپے جمع کر لینا بچوں کا کھیل تھا۔ انھوں نے مائیکروفون بحری تار اور اخباروں کے ذریعے بھیک مانگی۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک اخبار نویس کا ہیٹ اتار لیا اور اسے کاسۂ گدائی کے طور پر استعمال کیا۔ وہ اخبار نویس ہی گاندھی جی کے اس نئے تجربہ کا پہلا شکار بنا۔ اور اُسے بھی بنائے ہوئے اس وقتی کاسۂ گدائی میں رقم ڈالنی پڑی۔

گاندھی جی بھیک مانگنے کے مشن پر جب بہار گئے تو انھوں نے کہا "میں چودہ سال کے بعد پھر بہار آیا ہوں۔ چودہ سال کے بعد اگر قحط بھی آئے تو آپ پریشان نہیں ہوتے۔ بہادری سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ دریدرنارائن کے اس نمائندے کی خواہش کو پورا کریں گے جو شاید دوبارہ آپ کے پاس نہ آسکے۔" امیر تاجروں نے جب امید سے کم دان دیا تو انھوں نے کہا "چندے کی اس فہرست کو پھاڑ دو اور نئی فہرست بناؤ۔ مجھے دوسروں کے مقابلے میں گجراتیوں سے زیادہ امید ہے۔ میں بھی ایک گجراتی "چیٹی" (بنیا) ہوں۔" ان کی اس جھڑکی کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت چندے کی رقم دگنی ہو گئی۔ لنکا والوں سے انھوں نے کہا تھا کہ "جب ہندو لنکا آئے تھے تو بھارت ماتا کے بچے بھوکوں نہیں مر رہے تھے، اس وقت ہمارا ستارہ

بلندی پر تھا اور اس کی چمک سے آپ نے فیض پایا تھا۔ اگر آپ اپنے اس قدیم رشتے کو مانتے ہیں اور اس رشتے پر فخر کرتے ہیں تو آپ کو صرف روپیہ پیسہ ہی نہیں بلکہ زیورات بھی دے دینے چاہئیں"۔ گاندھی جی نے کچھ کے لوگوں کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ ان لوگوں نے جو دان دیا ہے وہ صرف کچھ کے باشندوں پر ہی خرچ کیا جائے۔ "اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے تو آپ اس اعتماد کے ساتھ مجھے دان دیجئے کہ میں اس کا استعمال صحیح اور مناسب موقعے ہی پر کروں گا"۔

انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ "میرے پاس ہنومان جیسی طاقت نہیں ہے کہ اپنا دل چیر کر دکھا سکوں۔ اگر میں ایسا کر سکتا تو آپ یہی دیکھتے کہ اس دل میں رام کی محبت کے سواء اور کوئی جذبہ نہیں ہے، اور اس رام کو میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ساتھ بھوک کا مقابلہ کرتے دیکھا ہے"۔ وہ کبھی کبھی دن میں بارہ بارہ جلسوں میں شریک ہوتے اور کہا کرتے تھے کہ "مجھے ایک پیسہ، دو پیسے یا محض ایک پائی جو کچھ بھی آپ دے سکتے ہوں دیجئے"۔ انھوں نے ایک شہری استقبالیہ میں سپاسنامہ قبول کرتے ہوئے پوچھا "چندہ کہاں ہے؟" انھوں نے کئی موقعوں پر کہا "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اور اکیلا بیٹھا رہوں گا"۔ اور اس طرح انھوں نے لوگوں کو چندہ دینے پر آمادہ کر لیا۔ کبھی کبھی لوگوں کی بھیڑ گھروں، زیوروں، چیکوں، نوٹوں، سونے چاندی اور تانبے کے سکوں، سوت اور کھادی کے ڈھیروں کے عطیے دینے کے لئے آدھی آدھی رات تک انتظار کرتی رہتی تھی۔ اُن کی اٹھترویں سالگرہ کے موقع پر انھیں سُوت کی اٹھتر لاکھ لچھیاں تحفے میں دی گئیں۔

ایک مرتبہ جمع کی ہوئی رقم میں ایک کوڑی بھی ملی۔ گاندھی جی کے خیال میں یہ کوڑی ایک بہت

بڑی قربانی کی علامت اور سونے سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔ ایک قاتل نے پھانسی کے تختے پر چڑھتے ہوئے وصیت کی تھی کہ اس کی ساری رقم (سو روپے) قومی کاموں کے لئے گاندھی جی کو دے دی جائے۔ گاندھی جی کو جلسوں میں جو چندہ ملتا تھا انھیں گننے اور اٹھانے کے لئے عموماً تین، چار آدمیوں کی مدد لینا پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ چندے کی رقم گننے کے بعد ایک والنٹیر گاندھی جی کے پاس آیا اور اس نے اپنے ہاتھ دکھائے جن پر تانبے کے سکوں کے ہرے داغ پڑ گئے تھے۔ یہ سکے ایک غریب دیہاتی نے زمین میں دبا کر رکھ چھوڑے تھے۔ گاندھی جی نے یہ دیکھ کر کہا کہ "یہ بڑا مقدس عطیہ ہے۔ ہمارے لئے تو یہ محض ایک تحفہ ہے لیکن لوگوں کے لئے یاس کی ماری اس تاریک دنیا میں امید کی ایک کرن اور ایک روشن مستقبل کی علامت ہے۔"

گاندھی جی پیشہ ورانہ گداگری کو روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کی یہ کوشش اور بہت سے کاموں کی طرح ناممکن سی معلوم ہوتی تھی۔ کام نہ کرکے اور شرم و حیا چھوڑ کر روٹی کے لئے بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانا گاندھی جی کے نزدیک انتہائی قابلِ نفرت بات تھی۔ اس لئے وہ غریبوں کو کام دینے کے بجائے بھیک دینے کے رواج کو ناپسند کرتے تھے ہندوستان میں چھپن لاکھ سے زیادہ بھکاریوں کی تعداد سے انھیں بڑا دکھ ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جسمانی طور پر معذور آدمیوں کو چھوڑ کر ہر شخص سماج کے لئے کچھ مفید کام کرے۔ اور خیرات پر گزارہ نہ کرے۔ ان کا خیال تھا کہ بھیک مانگنا اور دینا دونوں باتیں غلط ہیں۔ وہ لوگ جو جسمانی اعتبار سے بالکل ٹھیک ہوں اور بھیک مانگتے ہوں وہ چور ہیں۔

بہار کے زلزلے سے تباہ ہونے والے لوگوں اور کیمپوں میں رہنے والے پناہ گزینوں سے

گاندھی جی نے کہا تھا کہ انھیں اپنے لئے کھانا اور کپڑا حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کام ضرور کرنا چاہیئے۔ ورنہ ان میں خیرات پر تکیہ کرنے کی عادت پڑ جائے گی۔ اور خیرات پہ گزر کرنا بڑی بات ہے۔ اُن مصیبت زدہ لوگوں کو انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ "آپ ایمانداری سے کوئی مفید کام کیجئے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھیک مانگے۔ آپ کام مانگیے اور اسے ایمانداری سے کیجئے۔ کام کیجئے، بھیک نہ مانگیے۔"

لیڈر

اگر گاندھی جی فقیروں کے بادشاہ تھے تو لیڈروں کے شہزادے بھی تھے۔

انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں روز بروز امیر اور زیادہ امیر اور غریب اور بھی زیادہ غریب ہوتے جاتے ہیں۔ وہ مساوات چاہتے تھے۔ ان کا مقصد گاؤں کی زندگی کی نئی تنظیم اور گاؤں والوں کے لئے سہولتیں فراہم کرنا تھا۔

گاندھی جی نے ضرورت مندوں کی امداد کے لئے امیروں سے ان کا مال لیا۔ لوگوں کو اس کام کی طرف مائل کرنے کے لئے انھوں نے آگ لگانے اور خون خرابہ کرنے کے بجائے محبت اور اخلاق کے ہتھیاروں سے کام لیا۔ انھوں نے امیروں سے روپیہ تقسیم کرنے کے لئے کہا۔ پڑھے لکھے پنڈتوں سے کہا کہ وہ اپنا علم عوام کو سکھائیں۔ سرمایہ داروں سے کہا کہ وہ اپنے منافع میں سے مزدوروں کو بھی شریک کریں۔ حاکموں سے کہا کہ وہ محکوموں کو انسانی حقوق دیں اور کم ہمت اور کاہل اہل وطن سے کہا کہ وہ سینہ سپر ہو جائیں۔ انھوں نے ایسے غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھ سے حکومت کی باگ ڈور چھین لینے کے لئے وطن والوں کی ہمت افزائی کی جو عوام کی بھلائی کے کاموں کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ اس مخلص شخص کی مخلصانہ اپیل نے جوانوں، بوڑھوں سیدھے سادے دیہاتیوں اور سیانے تاجروں کے خیالات پر جادو کا سا اثر کیا۔ وہ آگ بگولے کی طرح ہندوستان کے ایک

سرے سے دوسرے سرے تک گئے۔ اور لوگوں کو اس بات کے لئے تیار کیا کہ وہ اپنا دھن اپنے بچے اور اپنا سب کچھ قوم پر قربان کر دیں انھوں نے پراگندہ ذہنوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ لوگوں نے اپنے بچے، پردہ نشین عورتوں نے اپنے زیور اور غریبوں نے اپنے چند سکے قوم کی خدمت کے لئے گاندھی جی کی نذر کر دیئے

ایک مرتبہ ملک میں فصل تباہ ہو گئی تھی۔ کسان بے حد پریشان تھے لیکن حکومت مطالبہ کر رہی تھی کہ وہ پورا لگان دیں ٹیکس کلکٹر کے خوف سے بے چارے کسان یہ سوچ رہے تھے کہ وہ اپنے بیلوں اور بیلوں کو لگان ادا کرنے کے لئے بیچ دیں۔ گاندھی جی نے کسانوں سے کہا کہ وہ اس حکومت کو ٹیکس نہ دیں۔ کسانوں نے "ٹیکس نہ دو" کی تحریک شروع کی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں کسانوں کی ایک جماعت نے عہد کیا کہ "ہم سوچ سمجھ کر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ حکومت کو اس سال کا پورا یا باقی لگان نہیں دیں گے۔ ہم تاوان کے طور پر اپنی زمینوں تک سے محروم ہو جانے کے لئے تیار ہیں۔" حکومت نے کسانوں کی زمینیں کھڑی فصلوں کے ساتھ ضبط کر لیں۔ گاندھی جی نے کسانوں سے کہا کہ انھیں محنت سے تیار کی ہوئی اپنی فصل پر پورا حق حاصل ہے اس لئے انھوں نے پیاز کے ایک ضبط شدہ کھیت کو لوٹ لینے کی ہدایت کی۔ ان کی ہدایت کے مطابق والنٹیروں کی ایک جماعت نے ساری فصل کھود ڈالی۔ لوٹنے والی جماعت کے سربراہ موہن لال پانڈیا کو گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اور انھیں "پیاز کا چور" لقب دیا گیا۔ اس جلسے کے صدر گاندھی جی نے موہن لال کی پیشانی پر فتح کا تلک لگایا۔

ایک اور موقع پر قحط کے زمانے میں بھی گاندھی جی نے کسانوں کو یہی مشورہ دیا تھا کہ لگان کے اس نقصان نے حکومت کے عہدہ داروں کو غضب ناک کر دیا اور انھوں نے کسانوں کی زمینیں ضبط کر لیں اور انھیں ان کی جھونپڑیوں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ بے چارے کسان اپنا بوریا بستر اٹھا کر اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ سرکاری عہدہ داروں نے ضبط کی ہوئی زمینوں کو نیلام کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں کوئی خریدار نہیں مل سکا۔ آخر طویل جانچ پڑتال کے بعد کسانوں کے بعض مطالبے منظور کر لئے گئے اور اُن کا اس سال کا لگان معاف کر دیا گیا۔

چمپارن میں انگریز نیل مالک کسانوں کو زبردستی نیل کی کھیتی کرنے پر مجبور کرتے تھے، مگر انھیں معمول کے مطابق اُجرت نہیں دیتے تھے۔ وہ کسانوں سے سخت محنت کراتے تھے اور خود بہت زیادہ منافع حاصل کرتے تھے۔ چمپارن سے ایک پریشان حال کسان فریاد لیکر گاندھی جی کے پاس پہنچا۔ گاندھی جی چمپارن گئے اور سارے معاملے کی اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد اس مسئلے کو سلجھانے کی ذمہ داری سنبھالی۔ ایک طویل بحث اور جھگڑے کے بعد آخر کار یہ بُرا رواج ختم کر دیا گیا۔ نیل کے انگریز مالکوں نے زیادہ منافع لینا بند کر دیا چمپارن سے صدیوں پرانا نیل کا داغ دُھل گیا۔

ہندوستان میں ایک آدمی کی اوسط آمدنی صرف ایک آنہ ہے۔ اس حقیر آمدنی کے مقابلہ میں نمک پر محصول بہت زیادہ تھا۔ نمک اور اناج پر گزارہ کرنے والے کروڑوں بھوکے لوگوں کے لئے یہ محصول ادا کرنا بہت دشوار تھا۔ ملک کے چند حصوں میں نمک کی

چٹانوں، سمندر یا جھیل کے کناروں سے قدرتی نمک مل جاتا تھا لیکن نمک بنانا قانوناً منع تھا۔ اس کے خلاف گاندھی جی نے نمک کی تحریک شروع کی۔ اس ظلم کو ختم کرنے کا انھوں نے پکا ارادہ کر لیا۔" میں جو کچھ چاہتا ہوں یا تو اسے پورا کر کے لوٹوں گا یا میری لاش سمندر میں تیر رہی ہوگی۔ ...... ہم مارے گئے تو جنت میں جائیں گے۔ گرفتار ہوئے تو جیل جائیں گے اور کامیاب ہوئے تو گھروں کو لوٹیں گے۔" سابرمتی آشرم سے پچیس دن میں دو سو اکتالیس میل تک پیدل چل کر گاندھی جی ڈانڈی پہنچے۔ ڈانڈی کے ساحل پر نمک کی ایک ڈلی اٹھا کر انہوں نے نمک کا قانون توڑا۔ سروجنی نائیڈو نے ہار پہنا کر اور تلک لگا کر اس قانون توڑنے والے کا استقبال کیا۔ اس وقت گاندھی جی نے کہا کہ "مٹھی بھر نمک اٹھا لینا تو بچوں کا کھیل ہے میں تو تمام نمک پر قبضہ کرنے جا رہا ہوں۔" تمام ہندوستان میں لوگوں نے قانون توڑ کر نمک جمع کرنا شروع کر دیا۔ پولیس نے ناجائز نمک پر اندھا دھند چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ پردہ نشین عورتوں کی پالکیوں تک کی تلاشی لی گئی۔ ایک مرتبہ کار سے گزرتے ہوئے گاندھی جی نے ایک پولیس گارڈ کو پکارتے ہوئے کہا "میرے پاس کچھ غیر قانونی نمک ہے۔ کیا تم مجھے روکنا چاہتے ہو؟"

گاندھی جی نے دھرسانا میں نمک کے گودام کو لوٹنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے ہی ان کی گرفتاری نے یہ سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ پھر بھی ان کے "اہنسا وادی لٹیروں" کی فوج مارچ کرتی ہوئی نمک کے گودام تک پہنچی۔ ایک خوفناک لڑائی شروع ہو گئی۔ پولیس نے فولادی موٹھوں والی لاٹھیوں سے رضاکاروں کو خوب پیٹا۔ اس مار پیٹ سے کسی کی ہڈیاں

ٹوٹیں تو کسی کا سر پھوٹا۔ کئی لوگ لہولہان ہو گئے۔ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں بھی بہت سے نمک کے گودام لوٹے گئے۔ آخر ایک سال کے اندر نمک کے قانون میں نرمی کر دی گئی۔ گھریلو ضرورت کے لئے اور جہاں نمک کی قدرتی کانیں تھیں ان کے نزدیک گاؤں میں نمک بنانا اور جمع کرنا قانونی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

برطانوی حکومت کو گاندھی جی کی شکل میں ایک ایسے سخت حریف سے سابقہ پڑا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ قانونی حیلہ بازی سے اچھا کام تو لوٹ مار کا ہے۔ انگریز ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ہندوستانی منڈی پر قبضہ کیا۔ اور ناجائز طریقوں سے ہاتھ کی کتائی اور بُنائی کی اُس ہندوستانی صنعت کو تباہ کر دیا جس پر ساری دُنیا رشک کرتی تھی۔ چرخے اور کرگھے بے کار ہو گئے۔ بعض دست کاروں نے کاشت کاری شروع کر دی بعض مزدوری کرنے لگے جس کا انھیں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ غریبی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ لنکا شائر سے کپڑا آنے لگا۔ اور ہندوستان کا کروڑوں روپیہ مانچسٹر جانے لگا۔ تاجروں کے کپڑا ناپنے والے گز کی حیثیت روپیہ بنانے والی طلسمی چھڑی کی سی ہو گئی۔

گاندھی جی کے ذہن میں ایک خیال یہ آیا کہ بدیسی کپڑے، شراب اور برطانوی سامان کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ انھوں نے سُوت کاتنے، کپڑا بُننے اور گھر کی بنی ہوئی کھادی استعمال کرنے پر زور دار پرچار کیا۔ اس پر لوگوں نے بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ گاندھی جی نے سُوت کاتنے اور ہاتھ سے کپڑا بُننے کے کام کو دوبارہ زندہ کیا۔ اور بدیسی کپڑے اور شراب کی دوکانوں پر دھرنا دینے کے لئے رضاکار عورتوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ انھوں نے

گاؤں گاؤں اور شہر شہر جاکر جلسوں میں تقریریں کیں اور آرائشی بدیسی سامان کو آگ لگا دی
اس طرح بدیسی سامان کی درآمد میں نمایاں کمی ہو گئی اور کئی برطانوی کارخانے بند ہو گئے۔
ہاتھ سے کتے ہوئے سوت نے برطانوی کپڑا بُننے والے کارخانوں کو مشکل میں ڈال دیا۔ وہاں
ہزاروں لوگ بے روزگار ہو گئے۔ برسوں بعد جب گاندھی جی لنکاشائر گئے تو انھوں
نے مل مزدوروں کے ایک جلسے میں کہا کہ "مجھے یہاں کی بے روزگاری دیکھ کر دکھ پہنچا
ہے۔ آپ کے یہاں تیس لاکھ بے روزگار ہیں اور ہمارے یہاں سال میں چھ مہینے تیس
کروڑ لوگ بے روزگار رہتے ہیں۔ یہاں بے روزگاروں کو سات شلنگ تک سرکاری
امداد ملتی ہے جب کہ ہمارے یہاں ماہانہ اوسط آمدنی محض سات شلنگ اور چھ پنس
ہے۔ کیا آپ ہندوستانی سوت کاتنے والوں اور کپڑا بُننے والوں اور ان کے بچوں کے
منھ سے نوالہ چھین کر خوشحال بننا چاہتے ہیں۔؟ ہندوستان جب اپنی ضرورت کے لئے
خود کپڑا تیار کر سکتا ہے تو اس پر لنکاشائر کا کپڑا خریدنے کی اخلاقی پابندی عاید ہوتی ہے؟
کیا آپ کروڑوں غریب ہندوستانیوں کی قبروں پر اپنی خوش حالی کے محل تعمیر کرنا چاہتے
ہیں؟" اس بے باک گفتگو نے انھیں برطانوی مزدوروں میں بے حد مقبول بنا دیا اور انھوں
نے تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کیا۔

گاندھی جی امیر اور غریب کے درمیان آمدنی کے فرق اور سماجی رعایتوں میں نابرابری
کو ختم کرنے کی ان تھک کوشش کرتے رہے۔ ایک بار بنگیوں کے جلسے میں ایک عورت
نے اپنے ہاتھ سے سونے کی چوڑیاں اتار کر گاندھی جی کو دیں اور کہا "آج کل شوہر اپنی

بیویوں کے پاس بہت کم چیزیں چھوڑتے ہیں اس لئے میں ہری جنوں کی سیوا کے لئے اپنے زیوروں میں سے بچی ہوئی بس یہ معمولی چوڑیاں دے سکتی ہوں۔" گاندھی جی نے یہ تحفہ قبول کرتے ہوئے جواب دیا کہ "میں مانتا ہوں کہ میں نے ڈاکٹروں، وکیلوں اور تاجروں کی آمدنی کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مجھے پچھتاوا نہیں ہے۔ ہندوستان جیسے غریب ملک میں جہاں لوگ روزانہ ایک پیسے کی خاطر میلوں پیدل چلتے ہیں وہاں کسی کا قیمتی زیور پہننا مناسب نہیں ہے۔" بعض وقت جب نوجوان عورتوں کو ہاتھ سے چوڑیاں اتارنے میں مشکل ہوتی تھی تو گاندھی جی ان کو کاٹ لیتے تھے۔ گاندھی جی کی اس مستقل کوشش پر کہ عورتیں قومی کاموں کے لئے اپنے زیور دان کر دینے کی طرف مائل ہو جائیں۔ کچھ لوگوں کو بڑا اعتراض تھا۔ لیکن گاندھی جی پر ان اعتراضوں کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ ہزاروں بہنیں جو میرے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں اگر سارے نہیں تو جتنے زیادہ زیور دے سکیں مجھے دے دیں۔" ان کی اس اپیل پر بہت سی عورتیں اپنے زیور دینے کے لئے تیار ہو جاتیں۔ ایک نوجوان بیوہ نے گاندھی جی کو اپنے گھر بلایا اور اپنے سارے زیور دان دے دیئے۔ ایک دوسری بیاہتا عورت جس کا شوہر چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پاتا تھا اس نے گاندھی جی کو اپنے گھر بلانے اور زیورات کا دان قبول کرنے کے لئے برت رکھا۔

ایک عام جلسے میں ایک نوعمر لڑکی کو دی اسٹیج پر آئی اور اپنا ہار چوڑیاں اور بالیاں اتار کر گاندھی جی کو دے دیں۔ وہ دان دینے والی عورتوں سے یہ وعدہ کرا لیتے کہ جو زیور انھوں نے دان کر دیئے ہیں ان کی کمی کو پورا نہ کیا جائے کیوں کہ عورت کا حقیقی زیور اس کی

سیرت کی پختگی اور پاکیزگی ہے۔" چھوٹے معصوم بچوں کو بھی گاندھی جی نہیں بخشتے تھے۔ ایک چھوٹی سی بچی جب ان کو پھول پیش کرنے آئی تو گاندھی جی کی تیز نظریں اس کی چھوٹی سی انگوٹھی پر جا پڑیں اور انھوں نے بچی کو انگوٹھی دان کر دینے کے لئے بہلا پھسلا کر آمادہ کرلیا انھوں نے ایک بچے کے سونے کے بٹن اتروالئے۔ اور کہا "تم مجھے ٹھیک سے پرنام کر دو اور جاؤ کیوں کہ تم جانتے ہو کہ میرا بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) ایک سو بچانوے ہے۔" لیکن وہ بچوں سے ان کے سرپرستوں کی مرضی کے بغیر کوئی زیور قبول نہیں کرتے تھے۔

گاندھی جی نے ایک تجربہ کار لٹیرے کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ اس کے باوجود وہ جن لوگوں کو لوٹتے تھے انھیں گاندھی جی پر بڑا اعتماد تھا اور وہ ان کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ ان کا ایک عقیدت مند اس بات پر راضی ہوگیا کہ اگر گاندھی جی اس کے گھر آکر ٹھہریں تو وہ ہر منٹ پر ایک سو سولہ روپے دے گا۔ مگر گاندھی جی اتنے مصروف تھے کہ اس کے یہاں وہ دو منٹ سے زیادہ نہ ٹھہر سکے۔

اُن کی اچانک بیماری کی خبر پاتے ہی اُن کے ایک ڈاکٹر دوست اُن کے پاس پہنچے گاندھی جی نے انھیں یہ کہہ کر کھسیانا کر دیا کہ "اگر میں اپنی جانچ کرنے کی تمھیں اجازت دے دوں تو تم مجھے کیا فیس دو گے؟" بجائے فیس ملنے کے ڈاکٹر کو خود اپنی جیب خالی کرنا پڑی۔ گاندھی جی کی دعوت پر موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس نے اپنی شاہانہ وکالت چھوڑ دی اور اپنے آبائی مکانات قوم کو دان دے دیے۔ گاندھی جی نے ہزاروں امیروں کو فقیر بنا دیا۔

جیل کا پنچھی

گاندھی جی نے بغاوت کا پرچار کیا، سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اور بار بار جیل گئے۔ وہ جب بھی گرفتار ہوئے انھوں نے اپنے جرم کا اعتراف اور سخت سے سخت سزا کا مطالبہ کیا۔ جنوبی افریقہ میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر جو الزام لگا تھا وہ الزام ان کی اپنی مہیا کی ہوئی شہادتوں سے ثابت ہوا تھا۔ جیل کے مجرموں کو جو سزا دی جاتی ہے ہندوستانی اس سزا کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انھیں بڑی شرم محسوس ہوتی تھی۔ اس کی تکلیفوں سے بھی خوف زدہ تھے۔ گاندھی جی نے اُن کے دلوں سے اِس خوف کو دُور کر دیا۔

گاندھی جی کو گیارہ مرتبہ قید کیا گیا۔ ایک بار تو وہ چار دن میں تین مرتبہ گرفتار ہوئے۔ اگر وہ جیل کی کل مُدت پوری کرتے تو انھیں گیارہ سال انیس دن تک جیل میں رہنا پڑتا لیکن کبھی کبھی ان کی سزاؤں میں کمی کر دی جاتی۔ اِس طرح انھوں نے کل ملا کر چھ سال دس مہینے جیل میں گزارے۔ وہ پہلی بار اُنتالیس سال کی عمر میں جیل گئے تھے۔ اور آخری بار جب انھوں نے جیل کے دروازے سے باہر قدم رکھا اس وقت وہ پچھتر برس کے تھے۔

گاندھی جی جنوبی افریقہ میں پانچ ستیہ گرہیوں کے ساتھ پہلی بار جیل گئے تھے۔ انھوں نے جیل کی زندگی کے بارے میں بڑے ہولناک قصے سُن رکھے تھے۔ اس لئے وہ قدرے گھبرائے

تھے کہ آیا اُن کے ساتھ سیاسی قیدیوں کا سا خصوصی برتاؤ کیا جائے گا یا انھیں اپنے ساتھیوں سے الگ رکھا جائے گا۔ جب وہ اس عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو ان کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آئے، کیوں کہ کبھی وہ اس عدالت میں بیرسٹر کی حیثیت سے جایا کرتے تھے۔ انھیں دو مہینے کی معمولی قید کی سزا دی گئی۔ عدالت کے باہر منتظر ہجوم کی نظروں سے بچانے کے لئے انھیں ایک بگھی میں پوشیدہ طور پر جیل لے جایا گیا۔ جیل خانے پہنچنے پر انھیں اپنی انگلیوں کے نشانات دینے پڑے۔ تمام کپڑے اتار کر ان کا وزن لیا گیا۔ اور جیل خانے کے میلے کپڑے پہننے کے لئے دیئے گئے۔ ہر دوسرے تیسرے روز ان کے دوسرے ساتھی جیل میں آنے لگے۔ پندرہ دن کے اندر ان کی تعداد ڈیڑھ سو تک جا پہنچی۔ ان سب کو ایک ایسے کمرے میں رکھا گیا جو پچاس آدمیوں کے لئے تھا۔ کچھ قیدیوں کے لئے خیمے لگا دیئے گئے تھے۔

جیل انسپکٹر، گورنر اور جیل کا داروغہ دن میں چار پانچ بار جیل کے معائنہ کے لئے آتے تھے۔۔ ہر بار گاندھی جی اور دوسرے قیدیوں کو ٹوپی ہاتھ میں لے کر قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ گاندھی جی نے خود کو ایسے کام کے لئے پیش کیا جس میں سخت محنت کرنا پڑے لیکن انھیں اس بات کی اجازت نہیں ملی۔

ہندوستانیوں کو جیل کا کھانا راس نہیں آیا۔ صبح، شام انھیں مکئی کا دلیا دیا جاتا جس میں نہ شکر ہوتی نہ دودھ اور نہ گھی، اور لوگ اسے نہیں کھا پاتے تھے۔ اکثر شام کو انھیں محض اُبلے ہوئے سیم کے بیج دیے جاتے تھے۔ نمک کے علاوہ کوئی اور مسالہ اور شکر انھیں نہیں دی جاتی تھی۔ یورپی قیدیوں کو گوشت، ڈبل روٹی اور سبزیاں ملتی

تھیں۔ سبزیوں کے چھلکے دوسری سبزیوں کے ساتھ پکا کر کالے قیدیوں کو دیے جاتے تھے۔ گاندھی جی نے سو ہندوستانی قیدیوں کے دستخط کرا کے جیل کے ذمہ دار حاکموں کے پاس شکایت بھیجی۔ اس پر اُن سے کہا گیا کہ "یہ ہندوستان نہیں ہے۔ یہ جیل خانہ ہے اور یہاں مزے دار کھانا نہیں دیا جا سکتا"۔ لیکن پندرہ دن کے اندر اندر ہندوستانیوں کے لئے چاول، ڈبل روٹی، سبزیاں اور گھی حاصل کرنے میں گاندھی جی کو کامیابی حاصل ہو گئی انہیں اپنا کھانا خود پکانے کی بھی اجازت مل گئی۔ گاندھی جی کھانا پکانے میں ہاتھ بٹاتے اور دونوں وقت کا کھانا تقسیم کرتے۔ گاندھی جی کے چیلے خاموشی سے ادھ پکا دلیا کھا لیا کرتے تھے۔ وہ کسی قسم کی شکایت نہیں کرتے تھے تیسری بار جب گاندھی جی جیل گئے تو ان کے کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں اٹھا۔ وہ پھل کھاتے اور انھیں کافی مقدار میں کیلے، ٹماٹر اور میوے مل جاتے تھے۔ انہیں جیل کے بعض قاعدے بہت پسند آئے اور رہائی کے بعد انہوں نے چائے ترک کر دی اور شام کا کھانا سورج غروب ہونے سے قبل کھانے لگے۔

جنوبی افریقہ میں اس کے بعد انھیں دو بار قید کیا گیا اور جو سزائیں ملیں وہ بڑی تکلیف دہ تھیں۔ انھیں قید بامشقت کی سزا دی گئی اور جس عدالت میں وہ دس سال وکالت کر چکے تھے اسی عدالت میں انھیں ہتھکڑیاں پہنا کر لے جایا گیا۔ انھیں افریقی مجرموں کا لباس پہنایا گیا: ایک فوجی ٹوپی، ڈھیلا ڈھالا بدنما کرتا جس پر قیدی نمبر لکھا تھا اور تیر کا بڑا سا نشان لگا تھا، اونچا پاجامہ اس پر بھی نمبر پڑے تھے، موٹے بھورے اونی موزے اور چمڑے کی چپل۔ انھیں تیز بارش میں اپنا بستر سر پر اٹھا کر کچھ فرلانگ تک

پیدل چلنا پڑ گیا۔ انھیں انتہائی خطرناک قسم کے حبشی اور چینی قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا چند زولو قیدیوں نے انھیں گالیاں دیں اور مارا پیٹا۔ پاخانے کے لئے کوئی بند جگہ نہیں تھی اِن بے ہودہ طریقوں سے گاندھی جی بہت پریشان ہوئے۔ وہ اُن کی زبان بھی نہیں سمجھ پاتے تھے۔ اِس لئے جلد ہی انھیں چار فٹ چوڑی اور چھ فٹ لمبی ایک تاریک کوٹھری میں بھیج دیا گیا۔ یہاں چھت کے قریب صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ گاندھی جی کو مقفل دروازوں کے پیچھے اپنا کھانا کھانا پڑتا تھا۔ انھیں ہر روز ورزش کے لئے باہر لایا جاتا تھا۔ چاولوں کے ساتھ گھی نہیں ملتا تھا۔ اس لئے انھوں نے احتجاج کے طور پر پندرہ روز تک چاول نہیں کھائے اور دن میں ایک بار مکئی کا دلیا کھا کر گزارہ کرتے رہے۔ آخر انھیں گھی اور روٹی دی جانے لگی۔ انھیں ناریل کی ایک چٹائی، لکڑی کا ایک چھوٹا سا تکیہ، دو موٹے کمبل اور کچھ کتابیں دے دی گئی تھیں۔ روزانہ صرف ایک بالٹی پانی ملتا تھا۔ گندے پانی کی بالٹی کوٹھری کے کونے میں پڑی تھالی کے اُوپر رکھی رہتی تھی۔ قیدیوں پر نگاہ رکھنے کے لئے اندھیرا ہوتے ہی بجلی جل جاتی تھی لیکن اس کی روشنی پڑھنے کے لئے بہت کم تھی۔ کبھی کبھی دل بہلانے کے لئے گاندھی جی اگر کوٹھری میں ٹہلنے لگتے تھے تو داروغہ چلّا کر کہتا تھا کہ "اس طرح مت ٹہلو تمہارے ٹہلنے سے کمرے کا فرش خراب ہوتا ہے"۔ وہ "قیمتی فرش" تارکول کا بنا تھا۔

گاندھی جی نے جب نہانے کی اجازت مانگی تو داروغہ نے ان سے کہا کہ وہ ننگے ہو کر جائیں گاندھی جی ایک سو پچیس فٹ دور غسل خانے تک ننگے نہیں جا سکتے تھے۔ آخر ان کی بات مان لی گئی کہ وہ کپڑے پہن کر جائیں اور غسل خانے کے پردے پر کپڑے لٹکا دیں لیکن وہ اپنا بدن

صاف بھی نہیں کر پاتے تھے کہ انھیں حکم ملتا "باہر نکلو" اگر وہ جلدی سے باہر نہ آجاتے تو ایک حبشی انھیں دھکا دے کر باہر دھکیل دیتا تھا۔

جیل میں گاندھی جی کو روزانہ نو گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ قیض کے لئے جیبیں کاٹتے، پھٹے کمبلوں کو سیتے، یا وارنش کئے ہوئے دروازوں پر روغن کرتے تھے۔ تین گھنٹے تک دروازوں اور فرش کو رگڑنے کے بعد بھی دروازے اور فرش جیسے کے تیسے ہی نظر آتے تھے۔ انھیں پاخانے کی صفائی کا بھی حکم ملا۔ گاندھی جی خود ان تمام مشکلوں کو ہنس ہنس کر جھیلتے رہے لیکن جب وہ اپنے ساتھیوں سے ملے تو ان کی حالت دیکھ کر وہ بالکل بدل گئے۔ کچھ لوگ تھک کر رونے لگتے تھے اور کچھ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ گاندھی جی کے کہنے پہ وہ لوگ اپنا گھر چھوڑ کر جیل کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ گاندھی جی کو یقین تھا کہ غلامی سے چھٹکارا پانے کے لئے تکلیفیں اٹھانا اور قربانی دینا ہی واحد طریقہ ہے۔ اور اس یقین ہی کے سہارے انہیں ذہنی سکون ملتا تھا۔

جیل میں صبح چھ بجے تک غسل اور ضروریات سے فارغ ہو جانا پڑتا تھا۔ سات بجے کام شروع ہوتا اور نو گھنٹے تک سب کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ گاندھی جی ایک میل ٹہلنے کے بعد خشک اور سخت زمین کی کھدائی کرتے تھے۔ ان کا وزن کم ہو گیا تھا، پیٹھ میں درد ہونے لگا تھا۔ ہاتھ میں پڑے چھالوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ اور پھاوڑا پکڑنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اگر ذرا دیر کو بھی وہ دم لینے کے لئے ہاتھ روکتے تو وارڈر چلا کر کہتا تھا "کام کرو کام" تب گاندھی جی نے وارڈر کو خبردار کر دیا کہ اگر تمھارا برتاؤ ٹھیک نہ ہوا تو میں کام کرنا بند کر دوں گا

اس دھمکی سے دارو غہ کچھ نرم پڑ گیا۔ گاندھی جی خدا سے دعا کرتے کہ انھیں اپنی عزت بچانے اور مقررہ کام ختم کر دینے کی طاقت دے۔

گاندھی جی جب ہندوستان میں "ہز میجسٹی ہوٹل" میں ٹھہرے تو حکومت ان کا خرچ اٹھاتی تھی۔ لیکن گاندھی جی نہیں چاہتے تھے کہ اُن پر ان کی ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے۔ ایک بار انھوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے سارا سامان اور فالتو برتن اُٹھالے جانے کے لئے کہا۔ وُہ محض ایک لوہے کا پلنگ اور تھوڑے سے برتن استعمال کرتے تھے۔ وُہ اس بات کو کبھی فراموش نہیں کر سکے کہ یہ تمام خرچ ہندوستان کے لاکھوں بے زبانوں سے ٹیکس لے کر پورا کیا جاتا ہے۔ آغا خاں کے محل میں اپنی آخری گرفتاری کے بارے میں انھوں نے کہا تھا "بہت سے پہرے داروں کے درمیان جس شاندار محل میں مجھے گرفتار کیا گیا ہے میں اسے عوام کی دولت کا اسراف بے جا سمجھتا ہوں۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہوں تو ایسا کرنا انسانیت پر بہت بڑا ظلم ہے۔"

ہندوستان میں گاندھی جی کے پہلے مقدمے کا منظر ایک یادگار واقعہ تھا۔ کٹہرے میں کھڑے اِس ہندوستانی کو انگریز سیشن جج نے اپنی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے سر جھکا کر بڑے احترام سے سلام کیا۔ اِس نے گاندھی جی کو ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر صرف چند سال کی معمولی قید کی سزا دی۔ اُس نے اعتراف کیا کہ "جو لوگ سیاست میں آپ سے اختلاف رکھتے ہیں وُہ بھی آپ کو اونچے خیالات کا فقیرانہ زندگی گزارنے والا شریف انسان سمجھتے ہیں۔" گاندھی جی نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان کے چند ہر دل عزیز وطن

پرستوں کو اسی لئے سزا دی گئی ہے۔ اِس سزا کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں آگ سے کھیل رہا ہوں لیکن میں کروں گا وہی جواب تک کرتا رہا ہوں۔" گاندھی جی کے عدالت میں آتے اور جاتے وقت ساری عدالت اُن کی تعظیم کے لئے کھڑی ہو جاتی تھی۔ پولیس نے اپنے پیغاموں میں گاندھی جی کے لئے "بمبئی کا سیاسی قیدی نمبر ۵" کا خفیہ اشارہ استعمال کر رکھا تھا۔ اِس سزا کے بعد ان کا نام بیرسٹروں کے زُمرے سے خارج کر دیا گیا۔ جیل میں اُن کے قد اور شناخت کے خصوصی نشانات درج کر لئے گئے، انھیں ایک کوٹھری میں تنہائی کی قید میں رکھا گیا۔ سوائے ایک دھوتی کے جو وہ پہنے ہوئے تھے اُن کے پاس کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی ان کی اور ان کے کمبل کی تلاشی لی گئی۔ گاندھی جی نے اس وقت تو کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جب اُن کی پانی کی ٹھلیا کو ٹھوکر ماری گئی اس پر انھوں نے احتجاج کیا۔ اِنتہائی غصے کی حالت میں وہ کبھی کبھی لوگوں سے ملنا اور خط لکھنا چھوڑ دیتے تھے۔

گاندھی جی اپنی بے جا گرفتاری سے کبھی غصہ یا پریشان نہیں ہوئے۔ وہ جیل سے جب بھی باہر آئے ان کا ذہن زیادہ پاک اور تیز ہو جاتا تھا۔ ان کے نزدیک جیل ایک آرام دہ علاج تھا جہاں اِنسان اپنی عادتوں میں زیادہ پابندی کرنا سیکھ سکتا ہے اور جہاں اچھے ساتھیوں کی کمی اچھی کتابوں سے پوری ہو سکتی ہے۔ جیل میں وہ آزاد پرندے کی طرح خوش رہتے تھے۔ اُنھیں مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ جیل سے باہر وہ مختلف کاموں میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ مطالعہ کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ مگر جیل میں وہ بڑی باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے۔ جیل ہی میں انھوں نے اُردو سیکھی اور سنسکرت،

تامل، ہندی، گجراتی اور انگریزی کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ دو سال کے اندر مذہب ادب اور سماجی علوم پر مشہور مصنفوں کی ایک سو پچاس کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انھوں نے گیتا، قرآن، انجیل کا مطالعہ کیا اور بدھ مت، سکھ مذہب اور زرتشت مذہب کی کتابیں پڑھیں۔ رامائن، مہابھارت، اپنشد، منوسمرتی اور پتانجلی کے یوگ درشن کا بھی مطالعہ کیا۔ پینسٹھ برس کی عمر میں انھوں نے جیل کے ایک ساتھی سے ہیئت کے علم کا پہلا سبق لیا۔ انھوں نے ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لئے جیل کے حاکموں سے ایک دوربین بھی حاصل کر لی۔

گاندھی جی جیل میں بڑی پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ دن میں چار چھ گھنٹے سوت کاتتے اور تیز چال سے ٹہلتے تھے۔ آغا خاں محل میں پچھتر سال کی عمر میں انھوں نے کستوربا کو پڑھایا اور پوتی کو بھی جغرافیہ، جیومیٹری، تاریخ، گجراتی زبان کی قواعد اور ادب کے درس دیے اس سے پہلے وہ جیل کے چینی ساتھی کو انگریزی اور آئرلینڈ کے جیلر کو گجراتی پڑھا چکے تھے۔ جیل ہی میں انھوں نے بچوں کے لئے ایک درسی کتاب اور جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کی تاریخ لکھی۔ انھوں نے اپنشدوں کے اشلوکوں اور ہندوستان کے سنت شاعروں کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور وہ مجموعہ "سانگس فرام دی پرزن" SONGS FROM THE PRISON کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے آشرم کے لوگوں، ساتھیوں، جیل کے ذمہ داروں، گورنروں، وائسرائے اور برطانوی وزیراعظم کے نام جیل سے سینکڑوں خطوط لکھے۔ ہر ہفتے وہ آشرم کے بچوں کو کچھ ایسی دلچسپ باتیں لکھ بھیجتے کہ "اگر تم بغیر پروں کے اڑنا سیکھ لو تو تمہاری ساری مشکلیں آسان ہو جائیں میرے پر نہیں ہیں، پھر بھی میں اپنے تصور میں ہر روز تمہارے پاس اڑ کر آتا ہوں۔ کبھی ننھی وملا

کے پاس اور کبھی ہری کے پاس۔

"گاندھی جی نے اپنی تحریروں میں جیل کی باضابطہ زندگی کے فائدوں کا ذکر کیا اور یہ بتایا ہے کہ ایک مثالی قیدی کو جیل خانے میں کس طرح رہنا چاہیے۔ وہ چاہتے تھے کہ قیدیوں کو جو کام بھی دیا جائے اُسے وہ پورا کریں۔ اور جیل کے قاعدوں کی پابندی کریں البتہ وہ قاعدے غیر اخلاقی نہ ہوں۔ وہ بھوک ہڑتال بھی نہ کریں جب تک کہ ان کی بے عزتی نہ کی جائے یا انھیں خراب کھانا نہ دیا جائے۔ وہ اور ان کے ساتھی جیل کے حاکموں کے سامنے کبھی دب کر نہیں بیٹھے۔ اور نہ کبھی "سرکار سلام" کہا۔

گاندھی جی نے یہ تسلیم کیا تھا کہ انھیں سوراج حاصل ہونے پر بھی جیلوں کی ضرورت ہوگی لیکن وہ جیلوں کو اصلاح خانوں اور کارخانوں میں بدل دینا چاہتے تھے اور جیل کو ایسا اسکول بنا دینا چاہتے تھے جہاں بھٹکے اور گمراہ لوگوں کو تعلیم دی جائے۔ انھوں نے ایک مرتبہ جیل میں مشورہ دیا تھا کہ کس طرح قیدیوں سے مفید کام لیا جا سکتا ہے اور کس طرح جیلوں کو خود کفیل بنایا جا سکتا ہے۔ مگر جیل کے حاکموں نے ایک قیدی کی بتائی ہوئی اس قسم کی اسکیم کو قبول نہیں کیا۔

یہ مثالی قیدی اکثر نظم و ضبط کی پابندی اس قدر سختی سے کرتا تھا کہ جیل کے حاکم پریشان رہتے تھے۔ جب انھیں ڈبل روٹی کھانے کی اجازت مل گئی تو انھوں نے کاٹنے کے لئے ایک چھری طلب کی، وہ بغیر اس کے ڈبل روٹی نہیں کھا سکتے تھے۔ انھوں نے روزانہ چہل قدمی کے لئے زیادہ جگہ کا مطالبہ کیا۔ جن ساتھیوں کو اُن کی خاص نگرانی میں رکھا جاتا تھا گاندھی جی ان

کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ دمے کے مریضوں یا ایسے ہی دوسرے مریضوں کا علاج کرنا چاہتے تھے جو قدرتی علاج یا آیورویدک علاج کی ضرورت محسوس کریں۔ اور وہ اس کے لئے خاص رعایتیں چاہتے تھے، وہ جیل کے ذمہ داروں سے اپنی مانگیں پوری کرانے کے لئے طویل برت رکھتے۔ جب اُن کی حالت زیادہ خراب ہو جاتی تو جیل کے حاکم انھیں آزاد کردیتے تھے۔ وہ مہاتما جی جیسی دُنیا کی مشہور ہستی کی زندگی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ گاندھی جی کو جیل میں جب اپنڈیسائٹس کی شکایت ہوئی تو حکومت کو بڑی فکر ہوئی۔ فوراً ان کا آپریشن کرایا گیا۔ وہ جیل میں دو بار بیمار ہوئے تھے۔

گاندھی جی اکثر اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ جیل گئے تھے۔ آغا خان محل میں کستور با اور ان کے سیکریٹری مہادیو ڈیسائی کو بھی ان کے ساتھ نظر بند کیا گیا تھا۔ ان دونوں کا وہیں انتقال ہوا اور جیل ہی کے گھیرے میں دونوں کی آخری رسمیں ادا ہوئیں۔ گاندھی جی نے ان کی موت پر کہا تھا کہ" ان دونوں نے "کرو یا مرو" کے منتر پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگیاں آزادی کی دیوی کی قربان گاہ کی نذر کر دیں۔ اس طرح وہ امر ہو گئے ہیں۔"

جرنیل

جنوبی افریقہ نے گاندھی جی کو عظیم بنایا۔ ۲۳ سال کی عمر میں وہ ڈربن پہنچے تھے اس وقت وہ ایک شرمیلے اور بے حد زود حس نوجوان تھے۔ جنوبی افریقہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی انہیں ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستانیوں (کالے آدمیوں) کو گورے انگریز حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ ہندوستانیوں کو قلی کہتے تھے۔

ڈربن پہنچنے کے تیسرے دن وہ ڈربن کی عدالت میں گئے تو مجسٹریٹ نے انھیں، عدالت کے احترام کے لئے پگڑی اتارنے کا حکم دیا۔ گاندھی جی نے اس حکم کو اپنی توہین سمجھا۔ اور پگڑی اتارنے سے انکار کرکے عدالت سے باہر چلے گئے۔

ایک ہفتے کے بعد انھیں ریل گاڑی سے ایک دوسرے شہر جانا تھا۔ انھوں نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور ڈبے میں جا بیٹھے۔ اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر آیا اور اس نے حکم دیا کہ وہ تیسرے درجہ کے ڈبے میں جا کر بیٹھیں۔ جب انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انھیں اوّل درجہ میں سفر کرنے کا حق ہے تو انھیں گاڑی سے دھکے دیکر اتار دیا گیا۔ اس بے عزتی نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وُہ اندھیرے مسافر خانے میں تنہا بیٹھے، خیالات میں گم ہو گئے۔ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔؟ کیا وہ اس ملک سے چلے جائیں جہاں

ہندوستانیوں کے ساتھ اتنا بُرا سلوک ہوتا ہے یا ان کے حقوق کے لئے لڑیں۔؟ ان کے ملک کی عزت خطرے میں نظر آئی۔ آخر انھوں نے وہیں رُکنے کا عزم کر لیا۔ اِس فیصلہ کُن رات نے مستقبل میں گاندھی جی کے کام کا راستہ متعین کر دیا۔

گاندھی جی نے بقیہ سفر ایک بگھی کے ذریعہ طے کیا۔ انھیں بگھی کے اندر بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی تو وہ کوچوان کے قریب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انھیں یہ جگہ بھی خالی کر دینے اور پائے دان پر جو ٹاٹ بچھا تھا اس پر بیٹھنے کا حکم ملا۔ گاندھی جی نے اپنی جگہ چھوڑنے سے انکار کیا تو انھیں بری طرح مارا پیٹا گیا۔

شہر پہنچنے پر انھوں نے ایک ہوٹل میں کمرہ لینا چاہا۔ مگر یہاں بھی انھیں ٹکا سا جواب ملا۔ انھوں نے وہ رات ایک ہندوستانی دوست کی دوکان میں گزاری۔ اسے گاندھی جی سے ہمدردی تھی لیکن اُسے اس ناروا سلوک پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ اِس طرح کے واقعات تو ملک میں آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں، وہاں کے رہنے والے ہندوستانی اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ تو جنوبی افریقہ میں روپیہ کمانے آئے تھے اور انھوں نے اپنی عزت کا سودا کر کے روپیہ کمایا تھا۔ گاندھی جی کو ان کی اس غلامانہ ذہنیت سے بڑا دھکا لگا۔ انھوں نے اخبارات کو اور ریلوے اور بگھیوں کے ذمہ داروں کو شکایتیں لکھ کر بھیجیں۔

گاندھی جی کو جلد ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہندوستانیوں کو فٹ پاتھ پر چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات کے نو بجے کے بعد وہ کہیں آ جا نہیں سکتے اور نہ ٹرام میں اگلی نشست پر بیٹھ

سکتے ہیں۔ ان کے رہنے کے لئے الگ کچھ مخصوص قلی بستیاں ہیں۔ ایک بار گاندھی جی کو ایک سنتری نے فٹ پاتھ سے دھکا دے دیا تھا اور "قلی بیرسٹر" کہا تھا۔ ان کے بعض انگریز دوست ان کو کچھ خاص رعائتیں دلانا چاہتے تھے لیکن گاندھی جی نے بڑی خوش خلقی سے انکار کر دیا۔ وہ صرف اپنے لئے چند خاص سہولتیں حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو رنگ اور نسل کی رکاوٹوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اس پر کبھی شرم محسوس نہیں ہوئی اور نہ کبھی انھوں نے ناراض ہو کر مجرموں کو سزا دلانے کی کوشش کی۔

گاندھی جی نے اس شہر میں رہنے والے تمام ہندوستانیوں کی دشواریوں کی تفصیل اکٹھی کی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر انھوں نے ایک عام جلسہ بلایا اور ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ اپنی زندگی کی ڈگر بدلیں۔ اور ایمان داری سے صاف ستھری عادتیں اختیار کریں۔ اور نسلی، مذہبی اور علاقائی اختلافات بھول جائیں۔ انھوں نے گوروں کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کے ہم وطن یہ سمجھ لیں کہ خود ان کے برتاؤ کا اگر درست ہوگا تب ہی وہ انسانی حقوق کا مطالبہ کر سکیں گے۔ وہ برابر ان لوگوں سے ملتے رہتے تھے۔ اور ان کی دکھ بھری داستانیں بڑے صبر کے ساتھ سنتے تھے۔

ایک سال کے بعد ایک مسودۂ قانون پیش ہوا کہ ہندوستانیوں کو ووٹ دینے کا جو معمولی سا حق حاصل ہے اس سے بھی انھیں محروم کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے لوگوں کو اس کی مخالفت کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے رضا کاروں کی بھرتی شروع کی۔ عیسائی نوجوانوں، مسلمان اور پارسی تاجروں اور ہندو کلرکوں کو اس پر تیار کیا کہ وہ اپنی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں۔ ان کی

رہنمائی میں بعض لوگوں نے اس احتجاجی تحریر کی نقلیں کیں۔ جو گاندھی جی نے تیار کی تھیں بعض نے چندہ دیا۔ اور کچھ لوگوں نے بیداری کے اس پیغام کو دور دور کے علاقوں میں رہنے والوں تک پہونچایا، ایک ماہ کے اندر خاصہ چندہ جمع ہوگیا۔ اور دس ہزار لوگوں نے اس احتجاجی مراسلے پر دستخط کئے۔ اس احتجاج کی مطبوعہ نقلیں نٹال کے گورنر اور وزیر اعظم کو ہندوستان کے وائسرائے کو، ملکہ وکٹوریہ اور ہندوستانی اور انگلستانی اخبارات کو بھیجی گئیں۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا جو دستور تھا اس کا خوب چرچا کیا گیا۔ اگرچہ ہندوستانیوں کو کوئی حق نہیں ملا اور ان کے لئے ایک قانون بھی بن گیا لیکن لوگوں نے ایک غیر منصفانہ قانون پاس کرنے پر حکومت کے ذمہ داروں کو للکارنے کے لئے اپنی بے حسی اور بزدلی کو ترک کر دینا سیکھ لیا۔ گاندھی جی نے جلد ہی نٹال انڈین کانگریس کی بنیاد رکھی اور اس کے لئے ایک ضابطہ تیار کیا اور خود جا کر ممبروں سے چندہ جمع کیا۔

جنوبی افریقہ میں اپنے بیس سال کے قیام کے دوران گاندھی جی نے ایسے بہت سے کالے قانونوں کی مخالفت کرنے میں اپنے اہل وطن کی رہنمائی کی۔ ایک قانون کے تحت ہر ہندوستانی بالغ سے جبراً چالیس روپے سالانہ محصول لیا جاتا تھا، دوسرے قانون کی رو سے ان شادیوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جو ہندوستان میں ہوئی تھیں اور قانوناً جائز تھیں ایک اور قانون کے مطابق ہر ہندوستانی کو اپنی دس انگلیوں کے نشانات کا ایک سرٹیفکیٹ اپنے ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ انگلیوں کے نشانات عموماً مجرموں سے لئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی نے ان بے شمار لوگوں کو سینکڑوں احتجاجی مراسلے، اپیلیں اور درخواستیں بھیجیں جن کی حیثیت

اور اختیار کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ حکومت کے اہم ذمہ داروں سے بھی ملے۔ جب اس تمام احتجاج کو اخباروں اور جلسوں کے ذریعہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو گاندھی جی نے ستیہ گرہ — ناانصافی کا مقابلہ عدم تشدد سے کرنے کا ایک نیا ہتھیار ایجاد کیا۔

گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ انگلیوں کے نشانات کا اندراج نہ کرائیں اور عدم تشدد کی ایک طویل جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ جیل جائیں اور اگر ضرورت ہو تو جان دے دیں لیکن اس غیر منصفانہ قانون کے آگے سر نہ جھکائیں۔ انھوں نے کہا کہ "میں چاہتا ہوں تم موت کا خوف دل سے نکال دو۔ تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا بے انصافیوں کو ختم کرنے کا فوری اور بہترین علاج ہے۔" انھوں نے لوگوں کو باخبر کر دیا کہ اگر وہ ان کے تجویز کئے پروگرام پر سوچ سمجھ کر عمل نہیں کریں گے اور محض ان کی ذات پر بھروسہ کئے بیٹھے رہیں گے تو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکیں گے۔ ان کی ہدایتوں کو ہندی، گجراتی، تامل اور تیلگو زبانوں کے ذریعے اچھی طرح سمجھایا گیا۔ ان کی فوج نے مکمل عدم تشدد کے ذریعے جنگ لڑنے کا عہد کیا۔ گلیوں کے ان پڑھ لوگ، کسان، پھیری والے، کان کن، تاجر اور عورتیں بھی اس فوج میں شامل ہوئیں۔ گاندھی جی نے پانچ ہزار نہتے، پُرامن اور پرسکون ستیہ گرہیوں کی ٹولی کی قیادت کی۔ وہ اپنے کارروان کے ساتھ پیدل چلتے تھے۔ کھلے آسمان کے نیچے سوتے اور ان کے ساتھ پتلی دال اور ادھ کچرے چاول کھاتے تھے۔ وہ بیماروں کی تیمارداری کرتے تھے، بچھڑے ہوؤں کو تسلی دیتے تھے، کھانا پکاتے اور سب کو کھلاتے تھے۔ ان کی ذہنی طاقت کی طرح ان کی جسمانی قوت بھی برقرار رہی۔ تقریباً

ڈھائی ہزار لوگوں کو قیدِ بامشقت کی سزا دی گئی۔ ایک ہزار اشخاص بالکل تباہ کر دیے گئے اور کچھ لوگ مر بھی گئے۔ جو تاجر عیش و عشرت کی زندگی کے عادی تھے انھیں اپنے رہنما کے ساتھ جیل میں پتھر توڑنا یا بھنگیوں کا کام کرنا پڑا۔ کستوربا بھی ستیہ گرہ میں شامل ہوئیں اور جیل گئیں۔

انگلستان میں گاندھی جی کی تحریک پر ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ ہندوستان میں بھی کانگریس کے اجلاسوں میں جنوبی افریقہ کے مسائل پر غور کیا گیا۔ ایک انگریز سر ڈیڈربرن نے جو کانگریس کے صدر ہو گئے تھے، کہا "ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے اس کی ایک بہترین مثال جنوبی افریقہ کی اس تازہ خبر سے ملتی ہے۔ گاندھی جی کی عظیم رہنمائی میں ہندوستانیوں نے جو تہیہ کیا ہے اس کے لئے میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔" گاندھی جی کی قیادت میں جب یہ جتھا کوچ کر رہا تھا تو انھیں اس خرچ کے لئے روزانہ تین ہزار دو سو روپے کی ضرورت تھی۔ ہندوستان میں چندے کے لئے ایک اپیل کی گئی۔ عورتوں نے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں دے دیں اور راجاؤں اور تاجروں نے سیکڑوں روپے دیئے۔ ٹیگور نے بھی چندہ جمع کر کے بھیجا۔ آخر اس طویل جنگ کا خاتمہ ایک سمجھوتے پر ہو گیا جو ہندوستان کے حق میں تھا۔ گاندھی جی سمجھوتے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ یہ سمجھوتہ باعزت ہو۔

گاندھی جی ہندوستان واپس آئے تو یہاں بے شمار ہندوستانی تھے۔ پھر بھی پریشان حال لوگوں، کسانوں اور بدحال مزدوروں نے ان کی مدد حاصل کرنا چاہی۔ محض انکی

کوششوں سے چمپارن میں جبراً نیل کی کاشت منسوخ ہوگئی اور مزدوروں کو اقرار نامے کے ذریعہ پابند کرنے کا طریقہ ختم ہوگیا۔ انھوں نے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مخصوص قسم کی شکایتوں کو دور خود کرنے کی کوشش کیا کریں۔ اس قسم کے تمام احتجاجوں کی خاصی شہرت ہوئی اور سارا ہندوستان اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔

گاندھی جی نے جب کبھی کوئی بڑی اور عام تحریک شروع کی اُن سب میں ان کا طریقہ ایک ہی رہا۔ چمپارن کھیڑا اور بارڈولی کے کسانوں کی رہنمائی کے علاوہ انھوں نے تیس سال کے عرصے میں چار بڑی تحریکوں کی قیادت کی۔ انھوں نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور مسائل کو خوب اچھی طرح سمجھا۔ جو لوگ حکومت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وہ ہزاروں لوگوں سے ملتے تھے اور دن میں اٹھارہ بیس گھنٹے تک کام کرتے تھے۔ انھوں نے ہزاروں جلسوں میں تقریریں کیں۔ اور لوگوں کو نظم و ضبط کے اصول بتائے۔ اُنھوں نے عدم تشدد کے طریقہ اختیار کرنے کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے کہا "ملک کے سامنے ایک اور راستہ بھی ہے — تلوار کا راستہ۔ اگر یہ طریقہ ممکن ہوتا تو ہندوستان عدم تشدد کی سچائی پر دھیان نہ دیتا۔ آپ صرف تقریروں اور جلسوں سے سوراج حاصل نہیں کر سکتے۔ کچھ کام کرنے کے لئے پختہ عزم ہونا چاہئے۔ ہمیں ایسا بہادر سپاہی بننا ہوگا جو میدان چھوڑ کر نہیں بھاگتا۔ آپ اپنی زندگیاں قربان کر دینے کے لئے تیار رہیئے۔ اس کے لئے جواں مردی کی ضرورت ہے۔ مارنے کے بجائے اگر ضرورت ہو تو اپنی جان دے دیجئے۔ آخر کسی کو مار کر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا انسانی طاقت سے باہر کیوں

محسوس ہوتا ہے۔ دوسروں کو مارنا بہادری کی بات نہیں ہے۔ اپنی عزت اور آزادی کے لئے جان دینا بہادری کی بات ہے۔

ان کی عدم تشدد کی فوج میں عورتیں، بچے اور بوڑھے تک شامل ہو سکتے تھے۔ بچوں کی فوج "وانر سینا" کے نام سے مشہور تھی۔ اہنسا پر گاندھی جی کا عقیدہ اتنا مضبوط تھا کہ جب کبھی کہیں تشدد کی واردات ہو جاتی تو گاندھی جی ستیہ گرہ بند کر دیتے تھے۔ وہ کسی خفیہ تحریک کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ کھلے بندوں اس کا اعلان کیا کہ وہ اب کیا کرنے والے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ غصے، نفرت اور انتقام کے جذبوں کو اپنے دل سے نکال دیں۔

اس مشکل پسند رہنما نے کبھی لوگوں کو جھوٹی امیدیں نہیں دلائیں۔ اور اپنے سپاہیوں سے کہہ دیا کہ آپ کو لاٹھیوں اور گولیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، جیل جانا ہوگا، پھانسی پر چڑھنا ہوگا اور ممکن ہے کہ آپکی جائیداد بھی ضبط ہو جائے۔ یہ سب کچھ بغیر احتجاج کئے برداشت کرنا ہوگا۔ ان کے منتر "کرو یا مرو" کا مطلب تھا مصیبتیں جھیلنا۔ اور وہ جانتے تھے کہ اس طرح مصیبتیں جھیل کر ہی ہم دشمن کا دل موم کر سکیں گے۔

گاندھی جی نے جہاں بدیشی کپڑے کو آگ لگانے، لگان نہ دینے، نمک بنانے اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے کے لئے کہا وہاں انھوں نے لوگوں کو تعمیری کام کرنے کے لئے بھی کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ سوت کاتیں، کپڑا بنیں، گاؤں کی پنچایتوں کو دوبارہ زندہ کریں اور قومی اسکول اور کالج قائم کریں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ

وہ ایسا کرنے سے ایک سال کے اندر سوراج لے لیں گے۔ یہ مقصد یقیناً پورا نہیں ہوا لیکن زنجیروں میں جکڑے ہوئے ذہن آزاد ہو گئے عوام جاگ اٹھے۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا ان کی ڈانڈی یاترا نے جادو کا سا اثر کیا سینکڑوں عورتیں بھی پردہ چھوڑ کر نمک جمع کرنے نکل آئیں۔ اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ بھی ملک کی خدمت کے لئے مردوں کے دوش بدوش کام کر سکتی ہیں۔ وہ بدیسی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر دھرنا دینے میں بھی شریک ہوئیں۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی بار گاندھی جی نے بہت بڑے پیمانے پر عدم تعاون کے ساتھ ساتھ عدم تشدد کا استعمال کیا۔

گاندھی جی اکثر اپنی عدم تشدد کی لڑائی میں جنگی اصطلاحیں استعمال کرتے تھے۔ "میں جنگ کے لئے تیار ہوں، اس آفریدی کی طرح جو اپنی رائفل کے بغیر کچھ نہیں کرتا، بالکل اسی طرح عدم تشدد کا کوئی سپاہی بغیر سوت کاتے کسی کام کا اہل نہیں ہو سکتا۔ سوت کی لچھیاں آپ کی گولیاں اور چرخے آپ کی بندوقیں ہیں۔ آزادی کی حفاظت بندوقوں سے نہیں بلکہ ہاتھ سے کتے ہوئے سوت کی گولیوں سے ہو سکتی ہے ...... آپ دھرسانا سالٹ ورکس پر حملہ کریں گے تو وہ دھرسانا کی جنگ کے نام سے مشہور ہو جائے گی۔" اس لڑائی میں جنگ کے تباہ کن ہتھیاروں کا استعمال نہیں ہوا لیکن تمام سپاہیانہ خوبیاں۔ بہادری، شجاعت، حب الوطنی تحمل، قربانی موجود تھیں۔

گاندھی جی بزدلی کے مقابلے میں تشدد کو ترجیح دیتے تھے لیکن وحشیانہ طاقت کے مقابلے میں روحانی قوت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ

"کیا ایٹم بم نے آپ کے عدم تشدد کے عقیدے کو دھکا نہیں پہنچایا" تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ "نہیں"۔ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سچائی اور عدم تشدد دنیا کی سب سے زیادہ زبردست طاقتیں ہیں۔ اس کے سامنے ایٹم بم کی کوئی حقیقت نہیں ہے"۔ وہ بڑے دعوے سے کہتے تھے کہ ہندوستان نے اگر عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کر لی تو روئے زمین کی تمام مظلوم قومیں یہ سمجھ لیں گی کہ خود ان کی آزادی دور نہیں ہے۔

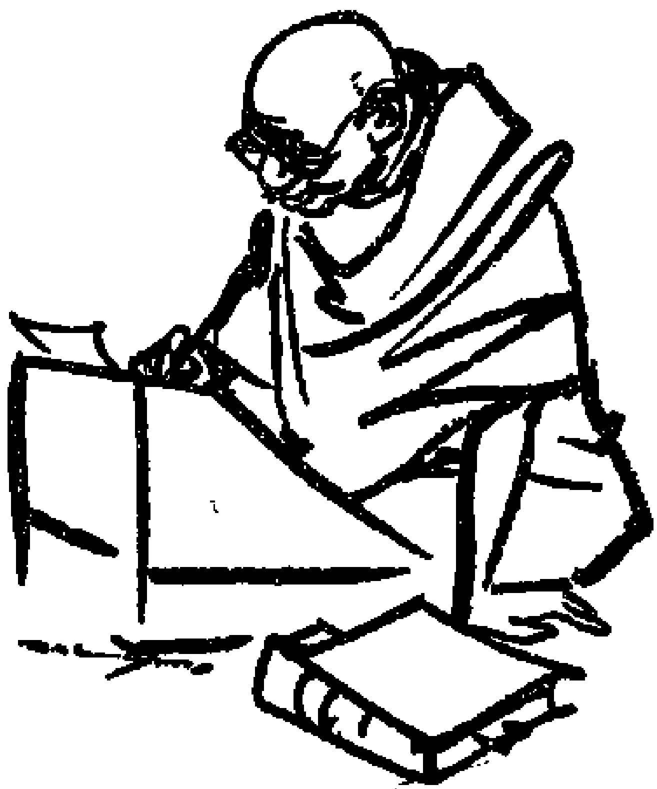

مُصنّف

موہن داس کرم چند گاندھی بے شمار کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں بیشتر کتابیں کتابی صورت میں نہیں لکھی گئیں تھیں۔ یہ کتابیں یا تو سچائی، اہنسا، سُدیشی اور چرخے پر کی گئی ان کی تقریروں اور مضمونوں کا یا عورتوں، طالب علموں اور راجاؤں سے انھوں نے جو خطاب کیا تھا ان کا مجموعہ تھیں۔

گاندھی جی ایک بہت اچھے مصنف تسلیم کئے گئے۔ اُن کا مقصد تحریر کے کسی خاص طرز کو اپنانا نہیں تھا نہ وہ لچھے دار الفاظ استعمال کرتے تھے ان کا اپنا الگ ایک زوردار اندازِ بیان تھا جو اُن کی اُمیدوں، عقیدوں، رنج و غم اور مایوسیوں کا آئینہ دار تھا ان کا انداز بہت سادہ، جامع اور واضح تھا اور مصنف کی زندگی کی طرح تصنع سے پاک تھا بعض انگریز وائسرائوں تک نے تسلیم کیا ہے کہ گاندھی جی بہت اچھی انگریزی میں اپنی بات بہت سیدھے انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے انتخاب کئے ہوئے الفاظ کا استعمال نہایت مناسب اور پسندیدہ ہوگیا ہے۔ گاندھی جی کا دعویٰ تھا کہ ان کی زبان یا ان کے قلم سے کبھی کوئی بے معنی لفظ نہیں نکلا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کے بیانات کی تیاری میں ان کی مدد کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی حروف جار میں گاندھی جی

کی طرح استادانہ مہارت رکھنے والا مجھے کوئی ہندوستانی آج تک نہیں ملا ...... مجھے یہ مسودہ تیار کرنے میں خاصی دشواری ہوئی تھی! ور گاندھی جی میرے کام پر ایک نظر ڈالتے تھے اور حروف جار کی ایک دو تبدیلیاں کر دیتے تھے۔ اس معمولی سی تبدیلی سے بات کہیں سے کہیں، پہنچ جاتی تھی اور میری بات گاندھی جی کی بات بن جاتی تھی۔"

انھوں نے انگریزی کے اچھے مصنفوں کی کتابوں اور انجیل کا بغور مطالعہ کیا تھا اور غالباً اسی مطالعے سے گاندھی جی نے الفاظ کے صحیح استعمال کا فن سیکھا تھا۔ وہ بہت پڑھتے تھے اور جو کچھ پڑھتے تھے اسے ہضم بھی کر لیتے تھے۔

ہندوستانی طالب علموں کے لئے گاندھی جی نے نوعمری کے زمانہ میں ایک کتابچہ "رہنمائے لندن" (لندن گائڈ) لکھا تھا مصنف کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی سیدھی سادی کوشش تھی ان میں لندن سے متعلق کار آمد معلومات درج تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے دو کتابچے لکھے۔ "ہر برطانوی سے ایک اپیل"
(AN APPEAL TO EVERY BRITON)
اور "ہندوستانی حق رائے دہی"
(THE INDIAN FRANCHISE)
پہلے پمفلٹ میں نٹال کے ہندوستانی باشندوں کی عام حالت کا بیان تھا۔ اور دوسرے میں نٹال کے ہندوستانیوں کے حق رائے دہی کی تاریخ تھی۔ "سبز کتابچے (GREEN PAMPHLET)" میں جو بیان لکھی گئی تھی وہ کلیتہً صداقت پر مبنی تھی اور ایک ماہ کے اندر اس کا دوسرا ایڈیشن ترمیم کے بعد شائع کیا گیا۔ جنوبی افریقہ کے اخباروں میں سبز کتابچے کا جو خلاصہ شائع ہوا تھا اس نے اہل یورپ کو ناراض کر دیا۔ اور جب وہ دوبارہ جنوبی افریقہ

گئے تو انھیں گھیر لیا گیا۔ اور لوگ ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ اپنے تجربے کی بنا پر گاندھی جی نے محسوس کر لیا کہ ان کی تحریروں کا خلاصہ صحیح طریقے سے نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں خود اپنے خیالات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ کانگریس کے دستور اور اس کی بہت سی تجویزوں کا مسودہ ان ہی کا تیار کیا ہوا ہے۔

غذا کے بارے میں گاندھی جی کے تجربے "رہنمائے صحت" (A GUIDE TO HEALTH) میں محفوظ ہیں۔ یہ کتاب 'انڈین اوپینین' میں چھپے اُن کے گجراتی مضامین کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا دوسری یورپی اور ہندوستانی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا اور اسے ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر بے شمار لوگوں نے پڑھا۔

جب کبھی ان کے ذہن میں کوئی خیال آتا تو وہ اسے بڑے اعتماد کے ساتھ لکھ لیتے تھے اور اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کی ہنسی اڑائیں گے۔ انھیں چلتی گاڑیوں اور چلتے ہوئے جہاز پر بھی لکھنا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کا خط بہت خراب ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۸۹٦ء میں ایک طویل بحری سفر میں انھوں نے "سیزر کا بچہ" پورا لکھ لیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں انگلستان سے جنوبی افریقہ کے بحری سفر میں اُنھوں نے "ہند سوراج" لکھ ڈالی۔ اس کتاب میں موجودہ تہذیب پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اس کے لئے انھوں نے جہاز کا کاغذ استعمال کیا۔ جب اُن کا دایاں ہاتھ لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو وہ بائیں ہاتھ سے لکھنے لگتے۔ اور اس طرح انھوں نے دس دن کے اندر کتاب مکمل کر لی۔ ٹالسٹائے نے اس کتاب کو پڑھا اور کہا تھا کہ اس میں خاموش اور پرامن جدوجہد کا

سوال نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے بڑا اہم ہے۔" قومی تعمیری کام کے موضوع پر ایک کتاب "تعمیری پروگرام" بھی ریل گاڑی ہی میں لکھی گئی۔ ان کے مسودوں پر اصلاح کے محض چند نشانات ہوتے تھے اور اگر کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ "یہ خوبی سچائی کے شیدائی کی روحانی ضبط کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔"

کسی خیال کا دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے موزوں الفاظ کا انتخاب کرنے کی ان میں قابلِ تعریف صلاحیت موجود تھی۔ وہ لفظی ترجمہ نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے (DEATH DANCE) کا ترجمہ "پتنگ نرتیہ" کیا تھا۔ رسکن کی کتاب (UNTO THIS LAST) کو پڑھ کر انھیں یہ محسوس ہوا کہ یہ تو ان کے اپنے عقیدے کی آواز بازگشت ہے۔ یہ کتاب گاندھی جی کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کر ڈالا۔ یہ کتاب "سرودیہ" کے نام سے شائع ہوئی۔ گاندھی جی نے کارلائل کی تحریروں کے کچھ حصے اور کمال پاشا کی زندگی کے کچھ حالات بھی گجراتی میں ترجمہ کئے۔ ان کی کتاب "ایک ستیہ گری کی کہانی"، افلاطون کی کتاب "سقراط کا مقدمہ اور اس کی موت" کی تشریح ہے۔ جب وہ جیل میں تھے تو انھوں نے "آشرم بھجناولی" اور ہندوستان کے صوفی شاعروں کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان نظموں کا ترجمہ "سانگس فرام دی پریزن" (SONGS FROM THE PRISON) کے نام سے شائع ہوا۔

گاندھی جی نے اپنی سوانح عمری گجراتی میں لکھی تھی۔ انھوں نے لکھنے کا ایک ایسا سلیقہ

اور جاندار انداز ایجاد کیا جس نے گجراتی زبان کو عوامی زبان بنا دیا۔ "تلاش حق" کے انگریزی ترجمے کو بہت سی مشہور ہستیوں نے ایک اچھے ادب پارے کی حیثیت دی ہے۔ اگر ایک طرف یہ کتاب دُنیا کی ایک عظیم شخصیت کو پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اُن کا قلم ان کے والدین، ان کی بیوی اور دوستوں اور اَن گنت دلچسپ اور ڈرامائی واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ واقعات کی جھلکیاں دکھا کر اور بیچ بیچ میں مکالموں کو موتیوں کی طرح پرو کر انھیں نے پڑھنے والے کی دلچسپی کا پورا خیال رکھا ہے۔ اس کتاب کا تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن، چینی اور جاپانی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

ان کی تمام تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ حق و صداقت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو کس قدر عزیز رکھتے ہیں۔ پھر بھی ان کی تحریریں اخلاقیات کا خشک اور غیر دلچسپ بیان نہیں۔ انھوں نے بچوں کے لئے ایک قاعدہ "بال پوتھی" اور اخلاقیات پر ایک کتاب "نیتی دھرم" لکھی۔ وہ بچوں کو کوئی ایسی نصیحت کرنا نہیں چاہتے تھے جس پر وہ عمل نہ کر سکیں۔ انھوں نے آشرم کے بچوں کو جو خطوط لکھے وُہ دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ وہ خط بہت لکھا کرتے تھے۔ اور ایک دن میں پچاس خط لکھ ڈالتے تھے۔ اُن کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ ان کے خطوں کا وہ مجموعہ ہے جس میں لگ بھگ ایک لاکھ خطوط ہیں۔

گاندھی جی "فن برائے فن" کے مخالف تھے ان کے نزدیک فن کی بنیاد سچائی پر ہونی چاہیئے اور ادب کی اہمیت بھی صرف اسی وقت ہے جب وُہ انسان کی ترقی میں معاون ہو

انھوں نے بھوکے ننگے لوگوں کے لئے آسان اور اچھی کہانیوں اور نظموں کی ضرورت محسوس کی جنھیں ایک کسان بھی بیلوں کو ہانکتے وقت مست ہو کر گا سکے اور گالیاں بکنا بھول جائے۔ ایک ادبی کانفرنس میں انھوں نے ادیبوں سے کہا کہ "کیا آپ نے کبھی ان لاکھوں گونگے اجاہل، لوگوں کی آرزوؤں اور خواہشوں پر بھی توجہ کی ہے؟ ہمارا یہ ادب آخر کس کے لئے ہے؟ میں ان کو کیا پڑھ کر سناؤں؟" انھوں نے ڈین فیرر کی کتاب "حضرت عیسیٰ کی زندگی" کی مثال دی جس کی زبان انگلستان کے عام لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ گجراتی انڈین اوپینین میں انھوں نے بہت سے ممتاز اصحاب اور خواتین کے مختصر خاکے لکھے تھے۔ ایک بار ان سے ان کے محبوب شاعر اور فلسفی رائے چند بھائی کی سوانح حیات لکھنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے کہا "مجھے ان کی زندگی کی کہانی لکھنے کے لئے ان کے گھر، ان کے کھیل کے میدان کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا، ان کے دوستوں، اسکول کے ساتھیوں، عزیزوں اور عقیدت مندوں سے ملنا ہوگا"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میدان میں بھی خیال آرائی کے بجائے وہ حقیقت پسندی کو اپنا رہنما بناتے تھے۔

گاندھی جی اکثر اخلاق، تمثیلوں اور واقعات کے حوالے ہندوستانی رزمیہ نظموں اور رام کرشن اور حضرت محمدؐ کی زندگیوں سے دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات کو عام لوگ بھی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ اُن کی تحریروں میں عوام کے دلوں کو چھو لینے کی جو حیرت انگیز قوت موجود تھی اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ ایسے خود غرض کانگریسیوں کی جو سفید پوش غنڈے بن گئے تھے اور چھوت چھات نسلی امتیاز اور غیر قانونی سزائے موت وغیرہ مکروہ

رسم و رواج کی مذمت جس بے باکی سے انھوں نے کی اس بےلاگ تنقید کے ساتھ ساتھ پیغمبرانہ شان بھی پائی جاتی تھی۔ لارڈ کرزن کے اس بیان کے خلاف کہ "حق کا معیار بڑی حد تک ایک مغربی تصور ہے"۔ گاندھی جی نے یہ دکھانے کے لئے بے شمار شہادتیں پیش کیں کہ حق کی پرستش رامائن مہابھارت اور ویدوں وغیرہ کے زمانے سے ہوتی چلی آئی ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ایک شریف انگریز کی حیثیت سے لارڈ کرزن کو اپنا بے بنیاد اور دل شکن اتہام واپس لے لینا چاہیئے۔ گاندھی جی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "حضرت محمدؐ کا پیغام امن اب کہاں ہے؟ اگر آج حضرت محمدؐ ہندوستان آجائیں تو وہ اپنے بہت سے نام نہاد پیرووں سے کنارہ کش ہو جائیں گے اور مجھے ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اپنا لیں گے۔ مغرب میں عیسائیت بالکل نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو وہاں کوئی جنگ نہ ہوتی"۔

گاندھی جی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "شاعر تو خود اپنی بنائی ہوئی طلسمی دنیا میں کھویا رہتا ہے"۔ لیکن وہ خود ایک ایسے چرخے کے غلام تھے جو کسی اور کی ایجاد تھا۔ پھر بھی ان کے خیالات اور زبان کے حسن نے ہمارے عہد کی بعض عظیم ہستیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اُن کی تحریروں کے بہت سے اقتباسات ایسے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ اپنے قلم سے لکھے چند لفظوں سے کتنی شوخ اور زندہ تصویریں کھینچ سکتے ہیں۔

"میسور کے پرانے مندر میں میں نے ایک چھوٹا سا مجسمہ دیکھا تھا جس نے زبانِ حال سے مجھ سے بات کی تھی۔ یہ ایک نیم عریاں عورت کا مجسمہ تھا جو اپنے آپ کو کام دیو کے تیروں سے بچانے کے لئے اپنے لباس کی تہوں کو درست کرنے کا جتن کر رہی تھی۔ بہرحال کام دیو

شکست کھا کر ایک بچھو کی شکل میں اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ میں اس کرب کو دیکھ سکتا تھا جو بچھو کے ڈسنے سے ہوتا ہے۔"

"کیا آپ اڑیسہ اور وہاں کی زندہ لاشوں کو جانتے ہیں؟ بھوکے اور مفلس لوگوں کی اس سرزمین میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے پڑی، پیتل اور چاندی میں حیرت انگیز کام کئے ہیں۔ جائیے اور دیکھئے کہ ایک کمزور اور ناتوان انسان کس طرح بے جان سینگوں اور دھاتوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ دیکھئے ایک غریب کمہار نے مٹی سے بے مثال چیزیں بنائی ہیں۔"

"دریا کے کنارے ایک جگہ ہے۔ یہ دریا درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے بیچ سے گزرتا ہے۔ دریا کی تہ میں ریت ہے، کیچڑ نہیں۔ دریا میں ایک چبوترا بنایا گیا۔ چبوترے کے سامنے دوسری طرف جو سڑک ہے اس پر بارہ ہزار سے زیادہ مردوں اور عورتوں کا ایک ساکت اور خاموش ہجوم ہے۔"

"صبح سویرے میں مالابار میں داخل ہوا۔ جانی پہچانی جگہوں سے گزرتے ہوئے اچانک ایک ایسے "نیاڈی" کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ابھرا جسے میں نے پہلی بار آنے پر بھی دیکھا تھا۔ چھوت چھات پر بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک تیز آواز سنائی دی۔ جو لوگ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے انھوں نے کہا "ہم آپ کو ایک جیتا جاگتا 'نیاڈی' دکھا سکتے ہیں۔" شاہ راہ عام اس کے لئے نہیں تھی۔ وہ میدانوں، کھیتوں سے ننگے پیر بے آواز قدموں سے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے قریب بلایا۔ کانپتے اور لرزتے ہوئے وہ میرے

پاس آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری طرح تمہیں بھی اس عام راستے پر چلنے کا حق حاصل ہے
اس نے کہا" ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں عام راستے پر نہیں چل سکتا۔" آپ مجھے مسکراتا
ہوا اور مذاق کرتا ہوا دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس مذاق،
مسکراہٹ اور ان قہقہوں کے پیچھے میرے سامنے اس نیاڈی کا چہرا اور وہ منظر ہے"
جو مالابار کے سفر میں میری نظروں کے سامنے رہے گا۔"

My dear Jawaharlal,
You must not be
stunned. Rather re-
joice that God gives
strength & direction
to do my duty. I could
not do otherwise. As
the author of non-coopera-
tion, a heavy respon-
sibility lies on my shoul-
ders. So give me in
writing your im-
pressions of Lucknow
& Cawnpore. Let me
drink the cup to the
full. I am quite at
peace with myself.
19 9/34 Yours lovingly
M.K.Gandhi

مہاتما گاندھی کی دائیں ہاتھ کی تحریر

My dear Jawahar

We are living in strange times. Sitla Sahai [must] depend immensely ~~[illegible]~~ Please keep me informed of further developments. What is this? Is he a lawyer? Has he ever any connection with revolutionary activity?

Before the Congress it would be better to make it as simple as possible so as to enable the present remaining workers to cope with it. [illegible] I know that your burden will be now increased.

But you [illegible] in [illegible] I do not [illegible] I wish and it.

I need your mental peace. I know that you will serve the country even as manager of a business. I am sure that Father will not mind any decision you may arrive at so long as it gives you complete peace.

Yours
Bapu

30 $\frac{9}{29}$

I see that I must reserve the right .. to send for M.D.

گاندھی جی کی بائیں ہاتھ کی تحریر (جواہر لال نہرو جی کی عنایت)

صحافی

انیس سال کی عمر میں انگلستان پہنچنے کے بعد گاندھی جی بڑی باقاعدگی سے اخبار کا مطالعہ کرنے لگے۔ ہندوستان میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں وہ اخبار نہیں پڑھتے تھے۔ وہ بہت شرمیلے تھے اور کسی جلسے میں تقریر نہیں کر سکتے تھے۔ اکیس سال کی عمر میں انھوں نے پہلی بار انگلستان کے ایک ہفتہ وار رسالے "ویجیٹیرین" کے لئے سبزی خوروں، ہندستانی غذائی عادتوں، رسم و رواج اور مذہبی تہواروں پر مضمونوں کا ایک سلسلہ لکھا۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں بھی اپنے خیالات کو سادہ اور آسان زبان میں ظاہر کرنے کی خصوصیت نظر آتی ہے۔

دو سال کے وقفے کے بعد گاندھی جی نے دوبارہ صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور اس وقت سے ساری زندگی وہ لکھتے ہی رہے۔ انھوں نے کبھی کوئی چیز محض اثر پیدا کرنے کے لئے نہیں لکھی وہ مبالغے سے بچے رہے۔ ان کی تحریروں کا مقصد صداقت کی خدمت، عوام کی تعلیم اور اپنی ذات کو ملک کے لئے مفید بنانا تھا۔

جنوبی افریقہ پہنچنے کے تیسرے دن عدالت میں گاندھی جی کی توہین کی گئی۔ انھوں نے اس واقعہ کی روداد ایک مقامی اخبار میں شائع کرائی۔ اور رات ہی رات انھوں نے

شہرت حاصل کرلی۔

پینتیس سال کی عمر میں انھوں نے "انڈین اوپینین" INDIAN OPINION کا چارج لیا۔ اور اس کے ذریعہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی رہبری کی اور ان میں اتحاد پیدا کیا۔ نیٹیکس میں اس ہفتہ وار کا ایک گجراتی ایڈیشن بھی ساتھ ساتھ چھپتا تھا۔ گجراتی "انڈین اوپینین" میں غذائیات کے علاوہ مثالی اشخاص اور خواتین کی زندگیوں پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ ان دونوں ہفتہ وار اخباروں میں گاندھی جی کے لکھے ہوئے مضامین ضرور ہوتے تھے۔ اخبار کا ایک ایڈیٹر بھی تھا لیکن دراصل سارا بوجھ گاندھی جی اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ رائے عامہ کی تربیت کرنا، ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان غلط فہمیاں کو دور کرنا اور اپنے اہلِ وطن کو ان کی کمزوریاں بتانا چاہتے تھے۔ انھوں نے "انڈین اوپینین" کے کالموں میں اپنی روح نکال کر رکھ دی اور جنوبی افریقہ میں چلائی جانے والی ستیہ گرہ تحریک کی مفصل روداد شائع کی۔ اخبار پڑھنے والے غیر ملکی ان کی تحریروں کے ذریعے جنوبی افریقہ کے واقعات کی ایک صحیح اور سچی تصویر دیکھ سکتے تھے۔ اخبار کا مطالعہ کرنے والی کچھ مشہور ہستیاں یہ تھیں۔ ہندوستان میں گوکھلے، انگلستان میں دادا بھائی نوروجی اور روس میں ٹالسٹائے۔ اپنے ہفتہ وار اخبار کے لئے گاندھی جی نے دس سال تک سخت محنت کی۔ "انڈین اوپینین" کے بدلے انھیں دو سو اخبار ہر ہفتے ملتے تھے۔ وہ ان اخباروں کو بڑی توجہ سے پڑھتے تھے۔ اور ایسی خبروں کو اپنے اخبار میں بھی شائع کرتے تھے جو "انڈین اوپینین" کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے مفید ہو سکتی تھیں۔

گاندھی جی جانتے تھے کہ نظریات کی اشاعت کے لئے اخبارات مؤثر ذریعہ ہوسکتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب صحافی تھے لیکن انھوں نے کبھی صحافت کو ذریعۂ معاش بنانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ صحافت کا مقصد خدمت ہے۔ "صحافت کو کبھی خود غرضی کے لئے استعمال کر کے اور روزی کمانے کا ذریعہ بنا کر ذلیل نہیں کرنا چاہیئے۔ اُسے نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ملک کے نظریات کا اظہار کرنا چاہیئے خواہ ایڈیٹر اور اخبار پر کچھ ہی کیوں نہ بیت جائے۔ اگر وہ عوام کے دلوں میں گھر کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ایک مختلف طریقِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔"

وہ انتہائی تلخ حقیقتوں سے کبھی انحراف نہیں کرتے تھے انھوں نے تصنع سے بھری ہوئی عبارت لکھنے سے گریز کیا۔ بغیر سوچے سمجھے کوئی بیان نہیں دیا۔ اور نہ غیر ضروری اہم صفت بیان کئے۔ وہ اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ ترجمہ میں غلطیاں نہ ہوں اور الفاظ کا انتخاب صحیح ہو۔ انھیں گم نام خطوط سے بڑی چڑھ تھی لیکن ایڈیٹر کے نام ایسے تمام خطوط بھی وہ عام طور پر شائع کر دیتے تھے جن میں مخالفانہ تنقید ہوتی تھی۔

انھوں نے جب انڈین اوپینین کا چارج لیا تھا اس وقت وہ نقصان میں چل رہا تھا۔ اس کے صرف چار سو خریدار تھے۔ وہ اس سے کوئی منافع حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کی ادارت میں اخبار اگر نفع میں نہیں تو نقصان میں بھی نہ چلے۔ "انڈین اوپینین" کو جاری رکھنے کے لئے انھیں

کچھ مہینوں تک بارہ سو روپے ماہانہ اپنے پاس سے خرچ کرنے پڑے۔ اس طرح لگ بھگ چھبیس ہزار روپے کا نقصان انھیں برداشت کرنا پڑا۔ مگر اس زبردست نقصان کے باوجود انھوں نے اشتہارات کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا تاکہ انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے زیادہ جگہ مل جائے۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ اگر انھوں نے اشتہارات قبول کر لئے تو وہ سچائی کی خدمت کر سکیں گے اور نہ آزاد رہ سکیں گے ان کا کہنا تھا کہ "آمدنی کے لئے چندے سے زیادہ اشتہارات پر بھروسہ کرنا بڑی شرمناک بات ہے۔ وہی اخبار جو شراب پینے کی برائیاں لکھتا ہے وہ شراب کی تعریف میں اشتہارات شائع کرتا ہے۔ ننانوے فی صدی اشتہارات محض بے کار ہوتے ہیں اور ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ زیادہ تر اشتہارات گمراہ کن اور گندے ہوتے ہیں۔"

گاندھی جی نے ناجائز ذرائع سے اپنے اخبار کی فروخت بڑھانے اور دوسرے اخبارات کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے کبھی معموں وغیرہ کے لئے انعام کا اعلان نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ خریداروں کو کسی اور قسم کا لالچ دے کر پھانسنا نہیں چاہتے تھے۔ "دوسرے اخبارات کو اپنی آپ بیتی کے باب نقل کرنے سے روک کر میں "ینگ انڈیا" اور "نوجیون" کی بکری بڑھانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔"

ہندوستان میں بھی تیس سال تک وہ اپنے ہفتہ وار اخبارات کے صفحات کو اشتہاروں سے بچاتے رہے۔ انھوں نے تجویز کیا تھا کہ ہر صوبے کے لئے اشتہار کا صرف ایک ذریعہ ہونا چاہیئے جو کارآمد اور مفید چیزوں کے اچھے بیانات شائع

کرکے "ینگ انڈیا" کی ادارت قبول کرنے کے بعد وہ ایک گجراتی اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ وہ ایک ملکی زبان کے اخبار کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے "ینگ انڈیا" کے گجراتی اور ہندی ایڈیشن "نوجیون" کے نام سے شائع کئے اور بڑی پابندی سے ان کے لئے مضامین لکھے۔ جس زمانے میں "ینگ انڈیا" کے بارہ سو سے کچھ ہی زیادہ خریدار تھے اس وقت "نوجیون" کے بارہ ہزار خریدار تھے۔ انھوں نے "نوجیون" کا سالانہ چندہ آٹھ روپے سے گھٹا کر چار روپے کر دیا۔ انھوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار کے صفحے کم کر دیئے۔ اور "نوجیون" سے حاصل منافع میں کھادی کے کام کے لئے پچاس ہزار روپے دان دیئے مگر اس کے لئے انھوں نے اخبار پڑھنے والوں سے معذرت نہیں چاہی۔

وہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ میرا مقصد عوام تک پہنچنا ہے۔ یہ مقصد صرف ملکی زبانوں کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میری زبان اجڈ اور دیہاتی ہے "نوجیون" کو چھکڑا چلانے والے اور مزدور پڑھتے ہیں، میری خواہش ہے کہ یہ کسانوں اور جلاہوں کی جھونپڑیوں تک میں پہنچ جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ اخبار ان ہی کی زبان میں ہو۔ وہی ہندوستان کی تعمیر کرتے ہیں۔ کسی اخبار کو انگریزی میں نکالنا ان کے نزدیک مسرت کا موجب نہیں تھا کیوں کہ انگریزی زبان کے ذریعہ صرف گنے چنے لوگوں تک پہنچا جا سکتا تھا۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ ان کے پڑھنے والے اپنے آپ کو اخبار کا مالک تصور

کریں۔ ان کی خواہش تھی کہ ہر ہندوستانی ان کے اخبار پر ان کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ اپنی ملکیت کی طرح نظر رکھے۔ مزید یہ کہ "نوجیون" میں اگر ہمالیہ کے برابر زبان کی غلطیاں ہوں تو اخبار پڑھنے والوں کو چاہیئے کہ وہ اخبار خریدنا چھوڑ دیں۔ اور ایک "نوجیون بائیکاٹ انجمن" بنا لیں۔ ان کے خیال میں اپنے ماتحت نامہ نگاروں اور دوسرے مضمون نگاروں کی اور چھاپے کے مروف جمانے والوں کی اور پروف خوانوں کی غلطیوں کا مدیر اخبار جواب دہ ہے یا مشین کے رک جانے سے اخبار وقت پر نہ نکل سکے اور کوئی شخص پرچے کو اپنے مقام پر حاصل کرنے میں ناکام رہے تو اس کی ذمہ داری بھی مدیر پر عاید ہوتی ہے۔ اُن کے تحریری مواد کے پہنچنے میں تاخیر کے سبب خواہ وہ برسا انکا یا انگلستان کے دورے پر ہوں اِن کی اِدارت میں چلنے والے اخبارات نہ بند ہوئے اور نہ ان کے نکلنے میں تاخیر ہوئی۔

گاندھی جی جیسے مصروف آدمی کے لئے کسی اخبار کی ادارت کرنا آسان کام نہ تھا۔ ستر سال کی عمر میں بھی انھیں "ہریجن" کے کاموں کی تکمیل کے لئے رات کو ڈیڑھ بجے اٹھ جانا پڑتا تھا۔ کاموں کی انتہائی زیادتی میں انھیں زیادہ لکھنا بھی پڑتا تھا۔ وہ اکثر چلتی گاڑی میں لکھتے تھے۔ ان کے چند مشہور بیانوں میں ریل گاڑی پر لکھے جانے کا اشارہ تھا۔ وہ دائیں ہاتھ سے لکھتے لکھتے تھک جاتے تھے تو بائیں ہاتھ سے لکھنے لگتے تھے۔ ان کے بائیں ہاتھ کی تحریر زیادہ صاف تھی۔ اپنی صحت کے بحال ہونے کے زمانے تک میں وہ ہر ہفتے تین چار مضمون لکھ لیتے تھے

ہندوستان میں انھوں نے کوئی اخبار گھاٹے میں نہیں چلایا۔ ان کے ہندوستانی اور

انگریزی دونوں زبانوں کے اخبارات کی فروخت چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ وہ جب قید تھے تو اخبار کی فروخت گھٹ کر تین ہزار رہ گئی۔ ہندوستان میں اپنی پہلی گرفتاری سے رہائی کے بعد اخبارات میں ان کی آپ بیتی کا ایک نیا فیچر قسط وار شائع ہونے لگا۔ یہ سلسلہ تین سال تک چلتا رہا اور عالمگیر دلچسپی کا سبب بنا۔ انھوں نے تقریباً تمام ہندوستانی اخبارات کو اپنی سوانح حیات کی اشاعت کی اجازت دے دی۔ جیل کے زمانے میں انھوں نے ایک نیا ہفتہ وار اخبار "ہری جن" نکالنا شروع کیا۔ "ینگ انڈیا" کی طرح اس کی قیمت بھی ایک آنہ تھی۔ یہ اخبار زیادہ تر اچھوتوں کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ کئی سال تک اس میں سیاست پر کوئی مضمون شامل نہیں کیا گیا۔ یہ پہلے ہندی میں نکلا تھا۔ حکومت نے گاندھی جی کو اس اخبار کے لئے جیل سے ہر ہفتے تین مضامین بھیجنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس اخبار کے انگریزی ایڈیشن کی بابت انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "میں انگریزی ایڈیشن نکالنے کے لئے آپ کو ہدایت کرتا ہوں کہ یہ مناسب طریقے سے نکلے۔ اس میں مواد مطالعے کے قابل اور ترجمہ بالکل صحیح ہو۔ لاپرواہی سے انگریزی اخبار نکالنے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے کہ ہندی ایڈیشن پر ہی اکتفا کیا جائے۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ اخبار خود کفیل نہ ہوا تو میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔" انھوں نے شروع میں تجربے کے طور پر تین ماہ تک اس اخبار کے دس ہزار نسخے نکالنے کا مشورہ دیا۔ دو ماہ کے عرصہ میں یہ اخبار خود کفیل ہو گیا۔ بعد میں یہ اخبار ایک مقبول نظریاتی اخبار بن گیا۔ لوگ اسے تفریح کے لئے نہیں بلکہ رہنمائی حاصل کرنے کے لئے پڑھتے تھے۔ یہ انگریزی، ہندی، اردو، تامل، تیلگو، اڑیہ، مراٹھی

گجراتی، کنڑ، اور بنگالی میں شائع ہوتا تھا۔ اور وہ اس کے لئے ہندی، اردو، گجراتی اور انگریزی میں مضامین لکھتے تھے۔

گاندھی جی کے اخبارات میں کبھی کوئی اشتعال انگیز موضوع نہیں ہوتا تھا۔ وہ تعمیری کاموں، ستیہ گرہ، عدم تشدد، غذا، قدرتی علاج، ہندو مسلم اتحاد، چھوت چھات، کتائی، کھادی، سودیشی، دیسی صنعتوں اور شراب بندی کے موضوع پر لگاتار لکھتے رہتے تھے۔ وہ تعلیم اور غذائی عادتوں کو دوبارہ مشرقی رنگ دینے کا پرچار کرتے تھے اور قومی برائیوں پر بڑی کڑی تنقید کرتے تھے۔

گاندھی جی کام لینے میں بڑے سخت تھے۔ اُن کے سیکریٹری مہادیو ڈیسائی کو ایک بار ریل کے ڈبے میں بھیڑ کی وجہ سے اور وقت پر کام پورا کرنے کے لئے پاخانے میں پناہ لینا پڑی تھی۔ گاندھی جی کے مددگاروں کو تمام ریلوں اور ڈاک کے نکلنے کے اوقات سے واقف رہنا پڑتا تھا تاکہ تحریری مواد وقت پر اشاعت کے لئے روانہ کیا جاسکے۔ ایک مرتبہ جس گاڑی سے گاندھی جی سفر کر رہے تھے وہ لیٹ جا رہی تھی اور گاندھی جی نے جو مضامین لکھے تھے۔ انھیں ڈاک سے بھیجنے کا بالکل وقت نہیں تھا۔ اس لئے ایک ہرکارے کے ذریعہ انگریزی مضامین کو بمبئی بھجوا دیا گیا۔ اور مضامین احمد آباد کے پریس کے بجائے بمبئی ہی میں طبع ہوئے۔ اس طرح اخبار ٹھیک وقت پر شائع ہوگیا۔

ہندوستان میں گاندھی جی کو پہلی بار ینگ انڈیا میں شائع ان کے سخت مضامین کی وجہ ہی سے قید کیا گیا۔

انھوں نے حکومت کے جاری کردہ زبان بندی کے کسی حکم کے آگے سر نہیں جھکایا جب حکومت نے انھیں اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں دی تو انھوں نے لکھنا ہی بند کر دیا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اخبار پڑھنے والوں کو اپنے اداریوں کی نقل کرنے کے لئے اور خبروں کو گشت کرانے کے لئے تیار کر لیں گے۔ انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ اُن کے اخبار پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ لیکن جب تک ان کے دم میں دم ہے ان کے پیغام کو نہیں دبایا جا سکتا۔ انھیں معلوم تھا کہ ضرورت کے وقت چھاپے خانے کی پرواہ کئے بغیر ہاتھ سے لکھ کر اخبار نکالا جا سکتا ہے۔ حکومت کے احکام نظر انداز کر کے انھوں نے ۱۹۱۹ء میں ایک ہفتہ وار اخبار "ستیہ گرہ" بغیر رجسٹر کرائے شائع کیا۔ اس ایک صفحے کے اخبار کی قیمت ایک پیسہ تھی۔

کئی سال کا تجربہ رکھنے والے صحافی کی حیثیت سے انھوں نے اچھی صحافت کی ڈائیو پر بڑے وثوق سے کہا تھا "صحافی چلتے پھرتے طاعون بن گئے ہیں۔ اخبارات لوگوں کے لئے بڑی تیزی سے انجیل، قرآن اور گیتا بنتے جا رہے ہیں۔ ایک اخبار فساد کی پیشگوئی کرتا ہے اور دہلی میں تمام لاٹھیاں اور چاقو بک جاتے ہیں۔ صحافی کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو بہادری کی تعلیم دے نہ یہ کہ ان میں خوف و ہراس پیدا کرے۔"

طابع وناشر

گاندھی جی نے "انڈین اوپینین"، "ینگ انڈیا"، "نوجیون" اور "ہریجن" کی ادارت کی تھی۔ اور ان اخبارات کو اپنے ہی پریس میں طبع کرکے شائع کرایا تھا، انھیں علم تھا کہ اگر ان کے اخبارات دوسروں کے پریس میں چھپے تو وہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار نہ کرسکیں گے۔ جب انھوں نے "انڈین اوپینین" کی ذمہ داری سنبھالی تھی تو اس وقت وہ گھاٹے میں چل رہا تھا۔ وہ پریس کو شہر سے دور فینکس کی بستی میں لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ اس طرح پریس نہیں چل سکے گا۔ مگر گاندھی جی نے آشرم میں ایک سائبان کے نیچے مشینیں اور دوسرا سامان اور فرنیچر بڑے سلیقے سے لگا دیا۔ پریس کو چلانے کے لیے تیل سے چلنے والا ایک پرانا انجن استعمال ہوتا تھا۔ ان کا اپنا دفتر ایک الگ کمرے میں تھا۔ اس پریس میں کوئی تنخواہ دار ملازم یا چپراسی نہیں تھا۔ "انڈین اوپینین" سنیچر کو روانہ کردیا جاتا تھا، جمعہ کو دوپہر تک سارے مضامین ترتیب پا جاتے تھے۔ بستی کے رہنے والے بچے، بوڑھے حروف کو ترتیب دینے، چھاپنے، کاغذ کاٹنے اور موڑنے، پتے چپکانے اور بنڈل بنانے میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان بنڈلوں کو ٹھیک وقت پر ریلوے اسٹیشن

پہنچانا ضروری تھا۔ عام طور سے وہ لوگ آدھی رات تک کام کیا کرتے تھے، لیکن جب کام زیادہ ہوتا تو اوروں کے ساتھ گاندھی جی بھی جمعہ کی شب رات بھر جاگتے رہتے تھے کستور با اور دوسری عورتیں بھی ان کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔ انگلستان سے ایک بار انھوں نے لکھا تھا کہ "مجھے امید ہے کہ خاص طور سے سنیچر کو تمام عورتیں فینکس پریس ضرور جاتی ہوں گی۔" "انڈین اوپینین" اتوار کو بازار میں آجاتا تھا۔

فینکس کی بستی میں جس رات "انڈین اوپینین" چھپ رہا تھا اسی رات اچانک تیل کا انجن بند ہو گیا۔ گاندھی جی اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے ہاتھ سے چلنے والے ایک پہیے کی مدد سے مشین چلائی اور اس طرح مقررہ وقت پر اخبار نکال دیا۔ اس طرح سے گاندھی جی کو پریس کے کام کی تفصیل سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ وہ مضامین لکھتے، حروف کو ترتیب دیتے، چھپائی کے کام میں ہاتھ بٹاتے اور مسودوں کی جانچ پڑتال کرتے تھے۔ بہت سے بچے بھی چھپائی کا کام سیکھنے لگے۔ ایک بار "انڈین اوپینین" کی تمام تر طباعت و اشاعت ان چھوٹے چھوٹے بچوں ہی نے کی۔ ابتدا میں "انڈین اوپینین" انگریزی، ہندی اور تامل چار زبانوں میں شائع ہوتا تھا بعد میں ایڈیٹروں کی کمی کی وجہ سے یہ صرف انگریزی اور گجراتی میں شائع ہونے لگا۔ گاندھی جی جب ہندوستان آتے اور اڈیار گئے تو اینی بیسنٹ نے دیکھا کہ گاندھی جی بڑی تجربہ کار نظروں سے وہاں طباعت کے کاموں کا معائنہ کر رہے ہیں۔

فینکس اور نوجیون پریس میں اخباروں کے علاوہ بہت سی ہندی، انگریزی اور

دوسری زبانوں کی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ گاندھی جی نے کبھی حکومت کو ضمانت کی رقم نہیں دی۔ ان کی اپنی تحریروں سے جو منافع ہوتا تھا وہ زیادہ تر کھادی کے کاموں پر صرف کیا جاتا تھا۔ انھوں نے ایک لاکھ روپے کی مالیت کے نوجیون پریس کا ایک وقف قائم کر دیا۔

خراب طباعت کو وہ ہنسا (تشدّد) سمجھتے تھے۔ وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ حروف واضح ہوں، کاغذ مضبوط ہو اور سرورق سادہ اور خوبصورت ہو۔ ان کا خیال تھا کہ دیدہ زیب سرورق کی مہنگی کتابیں ہندوستان جیسے غریب ملک کے پڑھنے والے عام لوگ نہیں خرید سکتے۔ ان کی زندگی میں نوجیون پریس نے کم قیمت پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ گجراتی میں چھپی ان کی آپ بیتی کی قیمت محض بارہ آنے تھی۔ اس کتاب کا ایک سستا ایڈیشن دیوناگری میں بھی شائع ہوا۔

گاندھی جی سارے ہندوستان کے لیے ایک ہی رسم خط کو ضروری اور مناسب سمجھتے تھے۔ کیوں کہ اس سے پڑھنے والوں اور پریس کے لوگوں کا وقت بچ سکتا ہے اور محنت بھی۔ اس سلسلے میں وہ دیوناگری رسم خط کو فوقیت دیا کرتے تھے کیوں کہ ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں کی بنیاد سنسکرت پر ہے۔ گجراتی کے "انڈین اوپینین" میں تلسی داس کی راماین کے ایک صفحے کا ذکر ہندی رسم خط میں شائع ہوا۔ گاندھی جی نے ہریجن کے لئے خود ٹائپ کے حروف کا انتخاب کیا۔ انھوں نے ایک پریس خریدنے کے لیے اپنے ایک ساتھی کو سودا چکانے کا کام سپرد کیا اور مشورہ دیا کہ " مشینری وغیرہ کو

بہت غور سے دیکھنا۔ اس کا اطمینان کرلینا کہ ساری مشینیں۔ ایک ڈبل رائل مشین اور دو ٹریڈل مشینیں۔ باقاعدہ کام کرتی ہیں یا نہیں۔ یہ بھی دیکھنا کہ حروف گھسے پٹے تو نہیں ہیں۔"

گاندھی جی حقِ اشاعت بحقِ مصنّف محفوظ کرنے کے خلاف تھے۔ ان کی ادارت میں جو اخبارات نکلتے تھے اس کی تحریروں پر سب کو حق حاصل تھا۔ ہاں جب انھیں اس کا اندیشہ ہوا کہ ان کی تحریروں کو مسخ کرکے پیش کیا جائے گا تو وہ حقِ اشاعت کے قاعدوں پر عمل درآمد کے لیے راضی ہو گئے۔

ان کا خیال تھا کہ بچّوں کی کتابیں بڑے حروف میں اچھے کاغذ پر شائع ہونا چاہئیں اور ہر بات کو اچھی تصویروں سے واضح کرنا چاہیے۔ وہ چھوٹے چھوٹے کتابچے چھاپنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ انھیں پڑھنے میں بچے اکتاتے نہیں اور انھیں آسانی سے سنبھال بھی سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ آشرم کے ایک شخص نے جو قومی تعلیم کے کام کی دیکھ بھال کرتے تھے ایک قاعدہ شائع کیا۔ اس کتاب میں ہر صفحے پر تصویریں تھیں اور وہ رنگین چکنے کاغذ پر چھاپا گیا تھا۔ اُس نے بڑے فخر سے پوچھا "باپو جی، آپ نے قاعدہ دیکھا! اس قاعدے کا سارا خیال میرا اپنا ہے؟" گاندھی جی نے کہا "ہاں یہ خوبصورت ضرور ہے لیکن اسے تم نے کس کے لیے شائع کیا ہے؟ پانچ آنے کی کتاب کتنے لوگ خرید سکیں گے؟ تم ہندوستان کے لاکھوں بھوکے ننگے لوگوں کے بچّوں کی تعلیم کے ذمہ دار ہو۔ اگر دوسری کتابوں کی قیمت ایک آنہ ہو تو تمہاری کتاب کی قیمت ایک پیسہ

ہونا چاہیئے۔" گاندھی جی نے ایک مرتبہ ایک ہفتہ وار اخبار کی ذمہ داری سنبھالی جس کی قیمت دو آنے تھی۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اس کی قیمت ایک آنہ فی پرچہ کردی۔

طباعت اور اشاعت میں پیسہ بچانا ہی گاندھی جی کا مقصد نہیں تھا۔ ایک مرتبہ نوجیون پریس نے گوکھلے کی تحریروں اور تقریروں کا گجراتی ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ترجمے کا کام کسی ماہر تعلیم نے کیا تھا۔ کتاب چھپ جانے پر گاندھی جی سے پیش لفظ لکھنے کی درخواست کی گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ترجمہ اچھا نہیں ہے تو انھوں نے کہا کہ اِسے ضائع کردیا جائے۔ جب انھیں بتایا کہ کتابت پر سات سو روپے خرچ ہوچکے ہیں تو وہ بولے "کیا آپ کے خیال میں یہ مناسب ہوگا کہ جلد بندی اور سرورق پر مزید خرچ کرکے اس مہمل چیز کو لوگوں کے سامنے لایا جائے؟ میں خراب ادب کو تقسیم کرکے لوگوں کا مذاق نہیں بگاڑنا چاہتا۔" کتاب کے سارے نسخوں کو جلادیا گیا اس طرح اسے ردّی میں بیچنے کی اجازت بھی نہیں دی۔

گاندھی جی نے ہمیشہ پریس کی آزادی کی حمایت کی۔ جب حکومت بڑے اور اہم مسئلے پر انھیں آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار سے روکتی تھی تو وہ اپنے اخبارات کی اشاعت ہی روک دیتے تھے۔

وہ تحریک کی آزادی کے حامی تھے اور اسی حمایت کی وجہ سے ان کا پریس ضبط ہوا، ان کے فائل ضائع کردیئے گئے، انھیں اور ان کے ساتھیوں کو جیل خانہ بھیجا گیا مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری انھوں نے تو یہ کہا "آؤ ہم مشینری اور سیسے کے ٹائپ

کے اس بُت کو توڑ دیں۔ ہمارے قلم ہمارے کارخانے ہیں اور نقل نویسوں کے ہاتھ چھاپے کی مشینیں۔ ہر شخص چلتا پھرتا اخبار بن جائے اور خبروں کو ایک دوسرے تک پہنچائے۔ ان کو کوئی حکومت نہیں روک سکتی۔"

فیشن ایجاد کرنے والا

گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں پتلون کے ساتھ چپل پہننی شروع کی۔ اس وقت یہ بات انوکھی سی تھی۔ وہ جوتوں کے مقابلے میں چپلوں کو اس لیے زیادہ پسند کرتے تھے کہ گرمیوں میں چپلیں پہننے سے پیر گرم نہیں ہوتے اور سردیوں میں انھیں آسانی سے موزوں پر بھی پہنا جاسکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم جنرل سمٹ نے جب یہ سنا کہ ہاتھ کی بنی چپلیں مضبوط اور آرام دہ ہوتی ہیں تو انھوں نے بھی چپل پہننے کی خواہش کی۔ گاندھی جی نے خاص طور سے ایک جوڑ چپل تیار کر کے جنرل سمٹ کو پیش کی۔

گاندھی جی کا کام کرنے کا طریقہ عام اور مقبول روایتی طریقے سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ ان کے ایجاد کیے ہوئے بعض فیشنوں کو دوسروں نے اپنا لیا کچھ طریقے نامقبول ہو کر ختم بھی ہو گئے۔

گاندھی جی نے جب پہلی بار کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی تو وہ یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئے کہ وہاں نہ صرف الگ الگ ذاتوں کے لیے الگ الگ باورچی خانے

ہیں بلکہ الگ الگ ذائقوں کے لحاظ سے بھی علیحدہ باورچی خانے ہیں، گاندھی جی معمولی معمولی چیزوں کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ اس لئے انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک لوگ اس علیحدگی پسند ذہنیت کو نہیں چھوڑیں گے اور جب تک اتحاد و اتفاق کے خیال کو فروغ نہیں دیں گے اس وقت تک سوراج حاصل نہیں ہو سکتا۔

وہ لوگوں کی غذائی عادتوں کو سادہ بنا کر دولت، وقت اور محنت کی اس فضول خرچی کو روکنا چاہتے تھے۔ انھوں نے غذا پر کئی تجربے کئے۔ ان کے آشرم میں سب کے لئے بغیر مسالے کا سادہ بناتاتی کھانا ایک ہی باورچی خانے میں پکتا تھا۔ یہ بناتاتی کھانا مسلمان، ہندو، پارسی اور عیسائی سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھاتے تھے۔

گاندھی جی کچے سلاد، پھل، گری دار میوے، ابلی سبزی، ہاتھ سے کٹے چاول اور ہاتھ سے پسے گیہوں کے آٹے کی غذائی افادیت پر بہت زور دیتے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ تازہ گڑ اور شہد میں صاف اور سفید شکر سے زیادہ حیاتین ہوتے ہیں اس طرح انھوں نے چیزوں کی ظاہری شکل و صورت کے مقابلے میں اس کے اصل جوہر کی قدر کرنا سکھایا۔

فیض پور کانگریس میں پہلی بار نمائندوں اور مہمانوں کو بغیر پالش کئے ہوئے چاول اور بے چھنے آٹے کی روٹیاں دی گئیں۔ گاندھی جی کا یہ بھی خیال تھا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس کسی گاؤں میں منعقد کیا جائے۔ پہلے پچاس سال تک کانگریس کے اجلاس میں زیادہ تر بڑے تعلیم یافتہ لیڈر اور دانش ور شامل ہوتے رہے۔ اجلاس بھی

کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسے بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہوتے تھے۔ گاندھی جی نے اس کو عوامی کانگریس کی شکل دی اور اسے عوامی کردار بخشا۔ وہ سادہ ہندوستانی لباس پہن کر حاضرین کے سامنے ہندی میں تقریر کرتے تھے۔

فیض پور میں تِلک نگر کا سارا منصوبہ گاندھی جی نے تیار کیا تھا۔ گاؤں کے کسانوں نے یہ نگر گاؤں میں آسانی سے دستیاب ہو جانے والے سامان سے تعمیر کیا تھا اور نندلال بوس جیسے آرٹسٹ نے گاندھی جی کے خیال کو عملی شکل دی تھی۔ چھت اور دیواریں بانس کی بنائی گئی تھیں۔ رنگے ہوئے بانسوں سے محرابیں بنائی گئی تھیں اور ان پر بانس کی ٹوکریاں سجاوٹ کے لیے الٹی لٹکادی گئی تھیں۔ گیٹ کے اوپر جو قومی جھنڈا لہرا رہا تھا وہ بھی گاندھی جی کی اپنی تخلیق تھا۔ چند ہی سال قبل انھوں نے جھنڈے کو آخری شکل دی تھی۔ یہ جھنڈا زعفرانی، سفید اور سبز تین رنگ کی آڑی پٹیوں سے ترتیب دیا گیا تھا۔ بیچ کی سفید پٹی میں گہرے نیلے رنگ کا چرخہ تھا جو عدم تشدد اور ہندوستانی عوام کی علامت تھا۔

ہمارے سادہ اور باوقار قومی لباس کے رواج کا سہرا بھی گاندھی جی کے سر ہے جنوبی افریقہ میں جس تاریخی یاترا کی انھوں نے رہنمائی کی تھی اس میں ہزاروں کان میں کام کرنے والے اور پابند مزدور شریک تھے اور ان میں سے زیادہ تر لوگ جنوبی ہند کے تھے۔ ان سب کو سخت جسمانی سزا دی گئی، بہت سے لوگ جیل گئے اور بہت سے مر گئے۔ ان لوگوں سے ہمدردی کا اظہار کرنے اور اپنے آپ کو اسی جماعت کا ایک فرد

ثابت کرنے کے لئے گاندھی جی نے کرتا اور دھوتی پہننا شروع کر دی۔ چھڑی کی بجائے ایک لاٹھی رکھی اور کندھے پر ایک جھولا لے کر چلنے لگے۔

گاندھی جی نے ایک زبردست حکومت کے منظم تشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک کارگر ہتھیار کی حیثیت سے ستیہ گرہ (تشدد کے بغیر ترکِ موالات اور عام سول نافرمانی کی تحریک) کا آغاز کیا۔ انھوں نے پرہلاد اور بھیشن کی پرانی مثال پیش کی کہ وہ بس جوش سے بغیر تشدد کے برائی اور ظلم کی طاقت کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ عدم تشدد کا طریقہ کوئی انوکھا طریقہ ہے لیکن برائی سے مقابلہ کرنے کے لئے اور سیاست کے میدان میں اس طریقۂ کار کو ایک بڑے پیمانہ پر شروع کرنے کی ان کی دلیرانہ کوشش ایک نئی چیز تھی۔ اس کی کامیابی نے لوگوں کو بہت متأثر کیا۔ ایک غیر ملکی صحافی نے ایک بار ان سے دریافت کیا کہ "کیا ایٹم بم نے آپ کے سچائی اور عدم تشدد کے عقیدے کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے؟" گاندھی جی نے جواب دیا "بالکل نہیں، میں ہمیشہ عدم تشدد اور سچائی دونوں کو انتہائی جرأت اور بہادری کی چیز سمجھ کر استعمال کرتا ہوں اور جس کے سامنے ایٹم بم کی کوئی حقیقت نہیں، صرف عدم تشدد ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو ایٹم بم تباہ نہیں کر سکتا۔" ہندوستان کے لوگوں کی زبردست طاقت کو متحد کرنے کے لئے گاندھی جی کا جتنا ہاتھ ہے اتنا اور کسی شخص کا نہیں ہے۔

ہندوستان نے گاندھی جی کی رہنمائی میں عدم تشدد کے ذریعہ آزادی حاصل کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان ایشیا، امریکہ اور افریقہ غرض دنیا کی تمام مظلوم قوموں کو

امید کا راستہ دکھاتے۔"جب تک ہندوستان کی لڑائی اہنسا کی لڑائی ہے وہ ظالم حکومتوں کے خلاف سب ہی مظلوم قوموں کی آزادی کی جدوجہد ہے۔" ہندوستان کی آزادی کے بعد بہت سی نوآبادیوں نے بغیر خون بہائے آزادی حاصل کرلی۔ امریکی نیگرو لوگوں میں انسانی حقوق حاصل کرنے کی تحریک بڑی کامیابی کے ساتھ پھیلی۔

گاندھی جی باطنی تبدیلی کے جو تجربے کر رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ ان کے لباس میں بھی ایک نمایاں تبدیلی ہوگئی تھی جنوبی افریقہ سے قطعی طور پہ ہندوستان واپس آجانے کے بعد گاندھی جی نے دھوتی، کرتا، لمبا کوٹ اور ایک بڑی کاٹھیاواڑی پگڑی باندھنی شروع کی تھی، لیکن جلد ہی انھوں نے یہ محسوس کیا کہ گرم آب و ہوا کے لئے یہ لباس مناسب نہیں ہے۔ یوں بھی پگڑی میں گزوں کپڑا ضائع ہوتا ہے، اس لئے وہ دھوتی، کرتا اور ٹوپی پہننے لگے۔ ان کو اس لباس میں عام اجتماعوں اور اہم جلسوں میں شریک ہونا نام نہاد شریف طبقے کو ناگوار گزرا۔ جب گاندھی جی نے سوت کاتنا اور کپڑا بننا سیکھ لیا تو ان کا پورا لباس کھادی سے تیار ہونے لگا۔ گاندھی جی کی ٹوپی کشمیری ٹوپی سے ملتی جلتی تھی، لیکن اس پر کڑھائی کا کام نہیں ہوتا تھا۔ گاندھی جی نے اس پر خاص زور دیا تھا کہ ٹوپی سفید ہو۔ لوگوں نے کہا کہ سفید ٹوپی بہت جلدی میلی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "میں نے صفائی کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کے لئے سفید ٹوپی کا انتخاب کیا ہے۔ یہ ہلکی پھلکی ٹوپی آسانی سے دُھل سکتی ہے اور اس کے سوکھنے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا۔ گہرے رنگوں کی ٹوپیاں بھی تو میلی ہوجاتی

ہیں البتہ ان میں میل چھپ جاتا ہے۔ کھادی کی دھوتی یا پاجامہ، کرتا اور گاندھی ٹوپی بہت مقبول ہوئے اور قومی لباس کی حیثیت سے تسلیم کرتے گئے۔

بہت سے بہاریوں، مارواڑیوں اور گجراتیوں نے اپنی پُرتکلف پگڑیوں کو چھوڑ کر گاندھی ٹوپی اختیار کرلی اور بہت سے مسلمانوں نے بھی اپنی ترکی ٹوپی کو ترک کردیا۔ بنگالی اور جنوبی ہند کے لوگ بھی جو عام طور سے ننگے سر رہتے تھے گاندھی ٹوپی پہننے لگے۔ سُدیشی تحریک کے دِنوں میں انگریزی سرکار گاندھی ٹوپی سے اسی طرح بھڑکنے لگی تھی جس طرح لال کپڑے سے بیل بھڑکنے لگتا ہے۔ گاندھی ٹوپی پہنے والنٹیروں پر پولیس بڑے ظلم ڈھاتی اور ان کی ٹوپیوں کو زبردستی اتار دیتی تھی۔ اسکول کے بچوں کو گاندھی ٹوپی پہننے پر سزا دی جاتی تھی۔ ایک والنٹیر پر کئی مرتبہ کھادی کی ٹوپی پہننے کی وجہ سے دس روپے جرمانہ کیا گیا اور جرمانہ نہ دینے پر اسے دس دن قید کی سزا دی گئی۔ خود گاندھی جی نے یہ ٹوپی تھوڑے عرصے تک ہی پہنی۔ ان کا لباس سادہ ہوتا گیا۔ آخر کھادی کی دھوتی، چادر اور چپل ان کا پہناوا بن گیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ لیڈر کو عوام کا صحیح نمائندہ ہونا چاہیے وہ اسی لباس میں یورپ اور انگلستان گئے اور بادشاہ سے ملاقات کی۔ ایک مرتبہ ایک ممتاز یورپی مہمان کو آشرم تک بیل گاڑی میں آنا پڑا تھا۔ اسی طرح اس کے تمام مہمان گاندھی جی کی جھونپڑی کے کچے فرش پر بیٹھتے اور گاندھی جی سے سنجیدہ مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ وہ آشرم کا کھانا کھاتے تھے۔ سیواگرام کا یہ تجربہ کار دانشور ایک اچھا میزبان بھی تھا اور اپنے مہمانوں کی ضرورتوں کا بہت خیال رکھتا تھا لیکن مہذب

اہلِ مغرب کی خاطر تواضع بہت سادہ طریقے سے کی جاتی۔ گاندھی جی کو اس پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی۔ ان کے خیال میں یہ صحیح نہیں تھا کہ کسی قوم یا ملک کی خصوصاً کسی غریب کی عظمت، ظاہری شان و شوکت سے برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف انہیں جھوٹی شہرت، ظاہری ٹیپ ٹاپ اور غریبی کو چھپانے کی کوشش سے دکھ ہوتا تھا۔ گاندھی جی کو اکثر اپنے آشرم سے وائسراؤں، گورنروں، برطانوی سفارتی رکنوں اور ممتاز غیر ملکی شخصیتوں سے اہم امور پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے دہلی، شملہ، بمبئی اور کلکتہ جانا پڑتا تھا۔ اپنے خیالات کی اشاعت اور اپنے ہم وطنوں سے تعلق قائم رکھنے کے لئے کئی بار انھوں نے سارے ہندوستان کا سفر کیا، لیکن کبھی ہوائی جہاز پر نہیں گئے انھوں نے ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کیا۔ آزادی سے پہلے دوسرے رہنما بھی ان کی تقلید کیا کرتے تھے۔ گاندھی جی کی خواہش تھی کہ حکومت کا سارا نظام بدل جائے۔ "جمہوریت میں کسان کو حکومت کا سربراہ ہونا چاہیئے۔ کسان وزیر اعظم کو اپنی رہائش کے لئے محل کی ضرورت نہیں ہوگی، وہ کچی جھونپڑی میں رہے گا، آسمان کے نیچے سوئے گا اور جب کبھی فرصت ہوگی تو کھیت میں کام کرنے گا۔"

گاندھی جی یہ محسوس کرتے تھے کہ تصنّع کے ماحول میں پروردہ لوگوں میں ایسے بے باک خیالات کو اپنانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل شروع سے بچوں کو ایک نئے انداز کی تعلیم دے کر اپنے کام کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مشہور ماہرینِ تعلیم کے آزمائے ہوئے تعلیمی تجربوں پر کافی غور کیا اور بچوں کے ذہنوں کی تربیت کا

نیا طریقہ تجویز کیا۔ اس طریقے کو انھوں نے نئی تعلیم کا نام دیا۔ اس نئی تعلیم نے خالص علمی تربیت کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ان کا مقصد صرف جہالت ہی کو نہیں بلکہ لاعلمی اور بے خبری کو ختم کرنا تھا، انھیں امید تھی کہ حرفے کے ذریعہ تعلیم دے کر وہ کم عمر طالب علموں کی شخصیت کو ابھار سکیں گے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کر سکیں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ بچوں میں سب مذہبوں سے رواداری، تمام قوموں سے محبت اور تمام کاموں کے احترام کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

انھوں نے عام پرارتھنا سبھاؤں میں مختلف مذہبوں کی کتابوں سے اخذ کیے ہوئے اقتباسات جمع کر کے انھیں پرارتھنا کی شکل دی۔

اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے گاندھی جی نے سینکڑوں عام جلسوں میں تقریریں کیں اور اپنے اخبارات میں بے شمار مضامین لکھے۔ انھوں نے بڑی کامیابی سے کئی ہفتہ وار اخبارات نکالے ان میں اشتہارات نہیں شائع کیے حالانکہ ان سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ انھوں نے دولت کو ٹھکرایا لیکن کسی شکل میں فضول خرچی کو پسند نہیں کیا۔ ایک بار انھوں نے جلسوں کے منتظمین سے کہا کہ وہ آرائش اور سجاوٹ پر غیر ضروری خرچ نہ کیا کریں۔ پھولوں کے بجائے سوت کا ہار پہنایا جا سکتا ہے۔ سوت کو گانٹھیں باندھ کر خراب نہیں کرنا چاہیے۔ جھنڈے اور جھنڈیاں کھدر کے ٹکڑوں سے بنائی جا سکتی ہیں سپاسناموں کو چھپوانے میں پیسہ نہ خرچ کیا جائے۔ کسی اچھے خوشنویس سے ہاتھ کے بنے کاغذ پر سپاسنامہ لکھوایا جا سکتا ہے اور اس کاغذ کو اچھی طرح سے کھدر ٹانکا جا سکتا

ہے۔ یا سپاسنامے کو لڑکے اور لڑکیوں سے کھدر کے ٹکڑوں پر کڑھوایا جا سکتا ہے۔"
اندرونی آرائش کے بارے میں بھی ان کا خیال نرالا تھا۔ وہ ایسا کمرہ پسند نہیں کرتے تھے جو قالینوں، فرنیچر اور نوادر سے بھرا ہوا ہے کھڑکیوں کے پردوں میں انھیں کوئی دلکشی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ کسی موقع پر وہ جنوبی ہند کے ایک بڑے تاجر کے گھر میں ٹھیرے۔ انھیں آرائش کی بے تکی چیزوں کا ڈھیر پسند نہیں آیا۔ انھوں نے کہا "بہت زیادہ فرنیچر کے درمیان میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہاں تو سانس لینا بھی مشکل ہے۔ آپ نے جو تصویریں لگائی ہیں ان میں سے بعض بڑی بھدی ہیں۔ اگر آپ 'بیچی ٹاڈ' کے محلوں کو آراستہ کرنے کا ٹھیکہ مجھے دیں تو میں اس سے بھی اچھی سجاوٹ اس خرچ کے دسویں حصے میں کر دوں گا، اور آپ کو اس مقابلے میں کہیں زیادہ آرام ہوگا اور ہوا بھی ملے گی۔ ساتھ ہی ہندوستان کے بہترین آرٹسٹوں سے میں اس کا سرٹیفیکٹ حاصل کروں گا کہ میں نے آپ کے مکانات کو انتہائی فن کارانہ طریقے سے سجایا ہے۔" سیواگرام میں گاندھی جی کی جھونپڑی کو دیکھ کر نندلال بوس نے جو تعریف کی تھی اس سے گاندھی جی کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ "فرش اور دیواریں گوبر سے لپی تھیں، کمرے میں کوئی تصویر، فوٹو یا مورتی نہیں تھی۔ ایک کونے میں چٹائی پر کھدر بچھا تھا اور بیٹھنے کے لئے ایک گدی رکھی تھی۔ کھدر سے ڈھکا ہوا لکڑی کا ایک بکس لکھنے کی میز کا کام دیتا تھا اور اس کے ایک طرف کانسے کی ایک چمکدار لٹیا رکھی تھی جس پر پیپل کے پتے کی شکل کا ایک ٹین کا ڈھکن

تھا۔ کمرے میں صفائی، سلیقے اور خوبصورتی کا ماحول تھا۔ وہ سینے پر کھدر کا ایک ٹکڑا لپیٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ فولاد کی آب دار ایسی ننگی تلوار کی طرح چمکتی ان کی وہ شخصیت نظر آئی ایسی شخصیت جس میں تشدد نام کو نہیں تھا

سپیرا

گاندھی جی بچپن میں سانپوں سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ اندھیرے میں باہر تنہا نہیں جا سکتے تھے تھے انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ چور، بھوت اور سانپ ان پر جھپٹنے کو تیار بیٹھے ہیں۔

پینتیس سال کی عمر میں انھوں نے نیم فقیرانہ زندگی بسر کرنا شروع کی اور آشرم میں رہنے لگے۔ ان کے آشرم میں رہنے کے لئے شروع میں کوئی جھونپڑی بھی نہیں تھی، وہاں ایک بڑا سا احاطہ، ایک کنواں، کھیتی باڑی کے لئے خاصی زمین اور ایک باغ تھا۔ شہر کے گرد و غبار اور ہنگامے سے دور یہ ایک پُر سکون جگہ تھی۔ گاندھی جی کے پاس روپیہ پیسہ تو تھا نہیں اس لئے انھوں نے بے کار اور سستی زمینیں حاصل کیں۔ فینکس کی بستی، ٹالسٹائے فارم، سابر متی آشرم، واردھا آشرم اور سیواگرام آشرام غرض ان سب آشرموں میں سانپ کثرت سے تھے۔ جھونپڑیوں کے بننے سے پہلے لوگوں کو ٹاٹ کے ڈیروں میں رہنا پڑتا تھا اور ایسی حالت میں بچوں کے ساتھ رہنا خطرناک تھا۔ ایک دن ایک زہریلا سانپ فارم یارڈ کی چھت پر چڑھتا ہوا نظر آتا، دوسرے دن بائیسکل کے قریب سانپ کا ایک جوڑا کنڈلی مارے پڑا ملتا۔ کبھی کبھی سانپ

سونے کی جگہ بھی گھس آتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کا کیا کیا جائے۔

گاندھی جی عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے اور بڑے کٹر وشنو تھے۔ انھوں نے اپنی اور اپنے بیوی بچے کی زندگی بچانے کے لئے بھی ایسی دوا یا غذا استعمال نہیں کی جس، میں مچھلی، گوشت یا چوزے کا جزو شامل ہو۔ گائے بھینسوں کے جسم سے دودھ کا آخری قطرہ بھی نکال لینے کے لئے اُن پر بڑا ظلم ہوتا تھا اس لئے گاندھی جی نے گائے بھینس کا دودھ پینا چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہ سانپ کو کس طرح مار سکتے تھے؟ ان کے آشرم کا عام اصول یہ تھا کہ سانپ کو مارا نہ جائے خواہ وہ زہریلا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے سانپوں کو رسیوں سے پکڑنے اور پھر آشرم سے دور اُن کو چھوڑ دینے کے لئے ایک تدبیر کی گئی۔ ہاں ان کو پکڑنا ممکن نہ ہوتا یا کسی شخص میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ قریب جاکر ان کو پکڑے تو پھر ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ گاندھی جی جانتے تھے کہ تشدد سے قطعی طور پر بچنا ممکن نہیں ہے۔ سبزیاں کھانا بھی پودوں کے ساتھ ظلم کرنا ہی تو تھا۔ آخر بڑے افسوس کے ساتھ انھوں نے اقرار کیا کہ "مجھے سانپ کے مارے جانے پر اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا سانپ کے کاٹنے سے کسی بچّے کی موت پر ہوتا ہے۔ میں اب بھی سانپوں سے ڈرتا ہوں اس لئے دوسروں سے کیسے کہوں کہ وہ سانپ سے نہ ڈریں؟" جب سانپوں کو بھگانے کی ساری ترکیبیں ناکام رہیں تو انھوں نے سانپوں کو مارنے کی اجازت دے دی۔

سانپوں کے بارے میں انھیں مفصل معلومات حاصل کرنے کی بڑی خواہش تھی

انھوں نے کیلن باخ کی مدد سے ایک غیر زہریلے سانپ اور ایک زہریلے سانپ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ کیلن باخ نے عملی مطالعے کے لئے ایک ناگ پکڑا، اسے ایک پنجرے میں بند کیا اور اپنے ہاتھ سے اسے غذا دی۔ آشرم کے بچوں کو سانپ کے دیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ کوئی بھی اس نئے دوست سے خوف زدہ نہیں تھا۔ مگر گاندھی جی خوش نہیں تھے۔ انھوں نے کیلن باخ سے کہا "ہم نے صرف اس کے طور طریقوں اور عادتوں کا مطالعہ کرنے کے لئے اسے قید کیا ہے۔ ناگ سے ہماری دوستی سچی نہیں ہو سکتی۔ میں یا آپ اس کے ساتھ کھیلنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ آپ کی دوستی میں خوف بھی شامل ہے۔ ناگ کی پرورش محبت کے جذبے سے خالی ہے۔" شاید خود ناگ نے بھی یہ محسوس کیا کہ لوگوں کا برتاؤ اس کے ساتھ دوستانہ نہیں ہے اس لئے وہ پنجرے سے نکل بھاگا۔

آشرم میں ایک اور جرمن دوست رہتے تھے جو بے ڈرے سانپوں کو قابو میں کر لیتے تھے۔ وہ سانپ کے بچوں کو پکڑ لیتے تھے اور انھیں اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ان سے کھیلا کرتے تھے۔ گاندھی جی بھی کچھ اسی قسم کی ہمت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس حد تک پہنچ جانا چاہتے تھے کہ سانپ کو چھوڑا جائے تو وہ یہ سمجھے کہ اسے کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے کہ وہ رام کا نام لے کر سانپ کے منھ میں ہاتھ ڈال سکیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری روز تک وہ سانپ یا بچھو کو ہاتھ سے پکڑنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ اس پر

گاندھی جی کو بڑی شرمندگی تھی۔

اہم کاموں میں مصروف ہوتے ہوئے بھی سانپوں کے مطالعے سے ان کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی۔ ایک بار کچھ نیتا ان سے مشورہ کے لئے ان کے پاس گئے اور یہ دیکھ کر گھبرا گئے کہ ان کی گردن میں سانپ لپٹا ہوا ہے۔ گاندھی جی اس وقت ایک سپیرے سے سانپ کو قابو میں کرنے اور اس کے کاٹے کا علاج معلوم کرنے میں محو تھے۔ تجربہ کرنے کے لئے کسی آدمی کو سانپ سے کٹوانا تھا۔ گاندھی جی اپنے آپ کو سانپ سے کٹوانے کے لئے تیار تھے لیکن ان کے ساتھی ایسی قیمتی زندگی پر ایسے خطرناک تجربے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ یوں ستر سال کی عمر میں گاندھی جی کو سپیرے کا ایک چیلا بننے کا موقع نہ مل سکا۔

برسوں پہلے جب وہ جیل میں تھے تو ان کے مسوڑھوں سے خون بہنے لگا تھا۔ ایک نیگرو قیدی ان کے پاس آیا۔ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے اشاروں میں گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دن وہ نیگرو قیدی چیختا ہوا ان کے پاس آیا، اس کی انگلی میں تکلیف ہو رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کسی چیز نے کاٹ لیا ہے۔ انھوں نے فوراً جیل کے اسپتال میں ایک پرچہ لکھ کر بھیجا۔ انھیں معلوم تھا کہ جس خون میں زہر شامل ہو گیا ہے اسے کھینچ لینے سے بالکل آرام ہو جاتا۔ بے چوں کہ کوئی صاف چاقو موجود نہیں تھا اس لئے انھوں نے زخم سے زہر کو چوسنا شروع کر دیا۔ رِستے ہوئے مسوڑھوں سے زہر کو چوسنا ایک خطرناک عمل تھا۔

لیکن وہ نیگرو کی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکے۔

گاندھی جی اس بات سے واقف تھے کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور ہر سانپ کے کاٹنے سے آدمی مرتا بھی نہیں ہے۔ صرف بارہ فی صدی سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔ وہ ملک کے لوگوں کو خاص طور سے گاؤں کے لوگوں کو سانپ کے بارے میں تمام روایتوں اور معلومات سے آگاہ کر دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے سانپوں کے موضوع پر تصویروں اور شکلوں کے ساتھ کچھ مضامین لکھے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہریجن میں لکھا تھا "ہم زہریلے اور غیر زہریلے سانپوں میں فرق نہیں کر پاتے ہیں، اسی لئے بغیر سوچے سمجھے تمام سانپوں کو مار ڈالتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں سانپ کا کاٹا ہوا شخص محض وہشت کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ زہریلے سانپ بھی جب تک پیروں کے نیچے دب نہ جائیں یا انھیں ستایا نہ جائے اس وقت تک نہیں کاٹتے۔ سانپ چوہوں کیڑوں مکوڑوں اور وبائی جانوروں سے کھیت کو بچاتے ہیں۔ اسی لئے انھیں 'چھتر پال' کھیتوں کا رکھوالا کہا جاتا ہے۔ ناگ پنچمی کے روز گاؤں میں مائیں سانپوں کے لئے طشتری میں دودھ رکھتی ہیں۔ اس طرح سانپوں سے دوستی کا اظہار کیا جاتا ہے سات سروں والے 'شیش ناگ' پر لیٹے وشنو کی تصویر مجھے بہت پسند آتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ بھگوان کتنی بے خوفی سے سانپ کی گود میں لیٹے ہیں اور وہ اپنے پھن کا سایہ اُن کے سر پر کئے ہے۔ بھگوان کی نظر میں سانپ کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔"

ایک بار دیکھا گیا کہ کچھ شریر لڑکے گاندھی جی کی کٹیا کے قریب ہی جگمگھٹا لگائے ہیں اور شیشے کے مرتبان میں رکھے ہوئے سانپ کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ سانپ پکڑ کر ایک سرجن کو بھیجا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ کریٹ ہے جو انتہائی زہریلا ہوتا ہے۔ اس نے اس کا سر کچل کر گاندھی جی کے پاس واپس بھیج دیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا، وہ تین دن تک زندہ رہا۔ تکلیف سے نجات دینے کے لئے اسے مار ڈالا گیا تھا اور وہ ایک مرتبان میں اسپرٹ ڈال کر رکھ دیا گیا تھا۔ گاندھی جی گاؤں والوں کو زندہ یا مردہ سانپ دکھانا چاہتے تھے۔ انھوں نے زندہ سانپوں کے لئے ایک پنجرا بنوایا تھا۔ کسی موقع پر گاندھی جی نے اپنے ایک فلسفی دوست سے پوچھا "جب سانپ پکڑنے والے پر سانپ حملہ کر دے تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟" اس نے جواب دیا "اُسے سانپ کو مارنا نہیں چاہیئے اور اگر سانپ اسے کاٹے تو وہ اسے کاٹنے نہ دے۔" گاندھی جی نے خود کبھی کوئی سانپ نہیں مارا اور نہ کبھی سانپوں نے انھیں یا آشرم کے رہنے والوں کوئی نقصان پہنچایا۔ ان کے کسی بھی آشرم میں کوئی شخص سانپ کے کاٹنے سے نہیں مرا۔ خود گاندھی جی کے جسم سے کئی بار سانپ چھو گئے لیکن سانپوں نے کبھی ان کو کاٹا نہیں۔

ایک بار سردیوں میں شام کے وقت گاندھی جی اپنے ایک دوست سے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ایک سانپ ان کی چادر پر چڑھ گیا اور اپنا پھن لہرانے لگا۔ گاندھی جی کے دوست نے ان سے کہا کہ وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ گاندھی جی ذرا بھی نہ

گھبرائے اور اپنے دوست سے کہا کہ وہ بھی ڈریں نہیں۔ ان کے دوست نے چادر کو پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اس سانپ کو دور پھینک دیا۔ ایک دوسرے موقع پر جب گاندھی جی کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے۔ ایک سانپ گاندھی جی کے سینے پر چڑھ گیا۔ مگر وہ بالکل نہیں گھبرائے۔ ایک مرتبہ اور جب گاندھی جی اسپتال میں پڑے تھے تو شنے نامہ کا ایک تعلیم یافتہ سپیرا ان کو دیکھنے آیا۔ وہ کچھ زہریلے سانپوں کو گاندھی جی کے بستر پر چھوڑ کر ان پر قابو پا لینے کی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ سانپوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان کے کمبل پر جھومنا شروع کر دیا۔ گاندھی جی دلچسپی سے انھیں دیکھتے رہے لیکن اپنے پیروں کو بالکل ساکت اور بے حرکت رکھا۔

ایک دن شام کو جب پرارتھنا کے دوران گاندھی جی خاموش بیٹھے ہوئے تھے تو ایک سانپ گاندھی جی کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے ساتھی گھبرا گئے۔ اس ہل چل سے سانپ پریشان ہو گیا اور اس نے گاندھی جی کی گود میں پناہ لی۔ انھوں نے خاموشی کے ساتھ پرارتھنا جاری رکھی۔ آخر سانپ چپ چاپ واپس چلا گیا۔ گاندھی جی سے جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو کیا محسوس ہوا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ "ایک لمحے کے لئے تو میں بھی گھبرا گیا تھا، پھر میں نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اگر سانپ مجھے کاٹ بھی لیتا تو میں کہتا "اسے مارو نہیں۔ اس پر ظلم نہ کرو۔ اسے کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے اور اسے آزادی کے ساتھ جانے دینا چاہیے۔"

پروہت

گاندھی جی نے برہمچاری اور غریبی کی زندگی اختیار کرکے یہ دکھایا کہ جو لوگ انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں انھیں شادی نہیں کرنا چاہئے۔

اس خیال سے پہلے انھیں اپنے کنوارے دوستوں کی شادی کرانے کی بہت فکر رہتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے دوست ایک بڑے خاندان کی طرح مل جل کر رہیں۔ انھوں نے اپنے ہندوستانی ساتھیوں کو اپنی بیویوں کے ساتھ جنوبی افریقہ بلایا اور اپنے انگریز دوستوں مسٹر ویسٹ اور مسٹر پولک کو جلد از جلد شادی کر لینے کا مشورہ دیا۔ پولک اپنی مالی دشواریوں کی وجہ سے کچھ ہچکچائے۔ گاندھی جی نے کہا کہ جب دو دلوں کا میل ہو گیا ہو تو پھر پرانی طے شدہ شادی کو ملتوی کرنا مناسب نہیں ہے۔ آخر دلہن انگلستان سے جنوبی افریقہ آئیں اور دوسرے ہی دن پولک نے ان سے شادی کر لی۔ شادی کے انتظامات خود گاندھی جی نے کئے اور دولہا کے ساتھی دوست بھی بنے

ہندستان میں اپنے آشرم میں گاندھی جی کبھی کبھی ایک پروہت کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔ لیکن شادی کرانے اور پروہت کا فرض انجام دینے کا ان کا

طریقہ پرانا اور رسمی نہیں تھا۔ انھوں نے ہندوؤں کی شادی کے طریقے کو سدھارنے کی کوشش کی اور بہت سی رسموں کا کھلم کھلا مقابلہ کیا۔ انھوں نے کبھی جہیز، دولت، ڈپلومے اور اونچی ذات کو ایسے اوصاف نہیں سمجھا جو دولہا یا دلہن کو شادی کا اہل بناتی ہو۔ شادی کے لئے اخلاق، صحت اور جسمانی محنت کی صلاحیت ان کے نزدیک لازمی چیزیں تھیں۔ جس شادی میں گاندھی جی پروہت بنتے تھے اس میں دولہا اور دلہن دونوں ہاتھ سے کتے اور بُنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ اور ہاتھ سے کتے ہوئے سوت کی مالا کے علاوہ اور کوئی زیور نہیں ہوتا تھا۔ مقدس آگ کے سامنے دولہا دلہن اپنی اپنی مالا ایک دوسرے کو پہنا دیتے تھے اور ویدک منتر پڑھتے تھے۔ دولہا کو کوئی قیمتی تحفہ یا جہیز نہیں دیا جاتا تھا۔

گاندھی جی نے 'دیتی لیتی' (جہیز) کے نامعقول رواج کی سخت مذمت کی اور کالج کے طالب علموں کو اس بات پر بہت جھاڑا کہ وہ عورتوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے اپنی بیویوں کو اپنے گھروں اور اپنے دلوں کی ملکہ بنانے کے بجائے خرید و فروخت کی چیز بنا دیا ہے۔ عورتیں تو مردوں کی 'اردھانگی' کہی جاتی ہیں یعنی 'نصف بہتر'۔ انھوں نے کہا تھا کہ "اگر میری کوئی لڑکی ہو تو میں زندگی بھر اُسے کنواری رکھنا پسند کروں گا لیکن کسی ایسے شخص سے اُس کی شادی نہیں کروں گا جو جہیز میں ایک کوڑی بھی مانگے۔"

وہ شادی کی دعوتوں میں شان وشوکت کے اظہار اور پُر تکلف انتظامات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جمہوریت کے اس دور میں شادی کی کسی تقریب پر دس روپے سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ اور مذہبی دستور کے علاوہ کسی رسم کو شادی کا جزو نہیں سمجھنا چاہیے۔ لیکن غریب سے غریب آدمی بھی اس حکم پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کسان جو شادی یا شردھا کی تقریبات کی وجہ سے بہت زیادہ مقروض ہو جاتے ہیں اُن سے گاندھی جی نے کہا تھا "میں آپ کا پروہت بن کر شادی اور شرادھ کی تقریب کرا دوں گا۔ اس کے لئے زیادہ پیسے کی ضرورت نہیں ہے" شرادھ کی تقریب کے جو مفہوم عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں گاندھی جی کو اس پر یقین نہیں تھا اُن کے نزدیک پُرکھوں کی شرادھ منانے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ اُن کی خوبیوں کو اپنی زندگی میں شامل کریں۔ "یگیوپ وِیت (جنیو) دھاگے کی جو خوبی بتائی جاتی ہے اس کو بھی انھوں نے تسلیم نہیں کیا۔" لوگوں کا اس پر پیسہ خرچ کرنا مجھے حماقت معلوم ہوتا ہے۔ آریہ لوگ اپنے آپ کو غیر آریوں سے ممتاز کرنے کے لئے اسے پہنتے تھے جو سوت محض اونچ نیچ کا فرق ظاہر کرتا ہے اُسے اتار کر پھینک دینا چاہیے۔ پاک دامنی سب سے اچھا سوت ہے۔"

اس پروہت نے کبھی کسی فیس کا مطالبہ نہیں کیا، ہاں کبھی کبھی ہریجن فنڈ کے لئے چندہ ضرور مانگا۔ ایک بار انھوں نے ایک جوڑے کی شادی کرائی،

جس میں دولہا دلہن الگ الگ ذاتوں کے تھے اور اُن سے ہریجنوں کے لئے کنوئیں بنوانے کے لئے پانچ ہزار روپے وصول کئے۔ ایک مرتبہ آشرم میں ایک عیسائی ہریجن نے ایک ہندو برہمن جوڑے کی شادی میں پروہت کا فرض انجام دیا۔

گاندھی جی نے ایک شادی کے بعد مہمانوں کی خاطر تانہ گڑسے کی تھی اور اس پرچھ آنے خرچ ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ ایک دولہا کو انھوں نے لکھا تھا کہ "تم یہاں اکیلے چلے آؤ، میں تمھاری شادی کرادوں گا اور تمھیں تمھاری بیوی کے ساتھ روانہ کردوں گا" ان کا خیال تھا کہ بارات میں دولہا کے ساتھ عزیزوں یا دوستوں کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ دولہا کے ساتھ سات آدمی آئے ہیں تو انھوں نے کہا "اوہو — 'سپتارشی' سات تجربکار آئے ہیں" ان لوگوں نے بتایا "جی ہاں 'ارُن دھتی' دولہن کی ماں بھی ہے"

اپنے تیسرے لڑکے کی شادی پر انھوں نے دولہا دُلہن کو گیتا، آشرم بھجناولی، منگل مالا اور تکلی تحفے میں دی۔ انھوں نے اپنے لڑکے سے کہا تھا "تم اپنی بیوی کی عزت کے محافظ ہو، اس کے مالک نہیں بلکہ سچے دوست ہو۔ اپنی زندگیوں کو وطن کی خدمت کے لئے وقف کردو۔ تم دونوں اپنی محنت سے اپنی روزی حاصل کرنا" دلہن کی ماں نے دولہا کو ایک چرخہ دیا۔ شادی سے پہلے دولہا دلہن نے برت رکھا، کنوئیں کے چاروں طرف صفائی کی گئوشالہ

کی صفائی کی اور پیڑوں میں پانی دیا۔ یہ سب کچھ تمام مخلوق سے ایکتا کا اظہار تھا۔ انھوں نے گیتا کا پاٹھ بھی کیا۔ گاندھی جی کا یہ عمل 'سپتاپدی' کے جزو تھے یعنی سات پھیروں کے۔ شادی طے ہو جانے کے بعد بھی گاندھی جی نے اسے دو سال تک ملتوی رکھا۔ لڑکی جب اٹھارہ سال کی ہو گئی تب ہی شادی ہوئی۔ وہ بچپن کی شادیوں کے خلاف تھے۔ "جب میں اپنے آس پاس تیرہ سال کی عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی شادی یاد آجاتی ہے اور مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگتا ہے ..... گود میں بٹھانے والی بچی کو بیوی بنا دینے میں مجھے کوئی مذہبی حکم نظر نہیں آتا۔ میں ایسی لڑکی کی شادی کو نہیں مانتا جس کی شادی اس کے ماں باپ نے اس کی مرضی کے بغیر کی ہو۔ پندرہ سال کی بچی کے بیوہ ہونے کا تصور بھی میں نہیں کر سکتا۔ بیواؤں کو بھی دوبارہ شادی کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا ان مردوں کو ہے جن کی بیوی مر چکی ہو۔" وہ بعض حالات میں طلاق کے بھی حامی تھے۔ ایک مرتبہ جیل سے انھوں نے ایک ایسی ہندو عورت کے لئے اپنی نیک خواہشوں کا اظہار کیا جو اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر اس کی زندگی میں دوسری شادی کر رہی تھی۔

گاندھی جی کو اپنے سناتنی ہندو ہونے کا دعویٰ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ذات، مذہب اور صوبے کے باہر شادی کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کی شادیوں سے مختلف ذاتوں اور مذہبوں کے لوگوں میں میل جول

بڑھے گا۔ جب اُن کے سب سے چھوٹے لڑکے (گجراتی بنئے) نے جنوبی ہند کی ایک برہمن لڑکی سے شادی کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

گاندھی جی اپنے دین دار وشنو والدین سے بے حد متاثر تھے۔ بارہ سال کی عمر سے وہ چھوت چھات کو گناہ سمجھنے لگے تھے۔ سترہ سال کی عمر میں انھوں نے رنگ ونسل کے فرق کا خیال نہ کرکے تمام انسانوں سے ایک جیسا سلوک کرنا سیکھا اور اکیس سال کی عمر میں انھوں نے گیتا، انجیل اور دوسرے مذہبوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ کسی مذہب کے ماننے والوں کے لئے یہ کہنا ایک احمقانہ بات ہے کہ "صرف ہمارا مذہب ہی سچا ہے اور دوسرے تمام مذہب جھوٹے ہیں۔" انھوں نے گیتا اور اپنشد کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ویدوں کے کچھ حصے بھی پڑھے تھے۔ انھوں نے جب تک ان کتابوں کی تعلیمات پر اپنی روزمرہ کی زندگی میں عمل کرکے نہیں دیکھ لیا اس وقت تک اُن کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ کئی مذہبوں کے مطالعہ نے ان میں رواداری پیدا کی اور اُن میں تکلیفوں کو بہادری سے برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوئی۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ جسمانی قوت پر بھروسہ کرتے ہیں وہ بے دینی پھیلاتے ہیں اور جو لوگ روحانی طاقت پر یقین رکھتے ہیں وہی مذہب کی سچائی کو سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مذہب تبدیل کرنا بے معنی بات تھی۔ وہ سکھ، بدھ، اسلام اور عیسائی مذہب کے اصولوں کو اتنی ہی خوبی کے ساتھ سمجھا سکتے تھے جتنا ہندو دھرم کے اصولوں کو؛ انھوں نے اکثر گرجاؤں میں

جا کر عبادت میں شرکت کی تھی۔ انھوں نے ایک بار ہندو مذہب پر چار مسلسل تقریریں
کیں۔ ان میں انھوں نے دوسرے مذہبوں کی نمایاں خصوصیتوں کا بھی ذکر کیا تھا۔
وہ حضرت عیسیٰؑ کے ارشادات کا اتنا موزوں استعمال کرتے تھے کہ یورپ
کے بعض لوگ انھیں پیدائشی عیسائی سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ جہاز کے عرشے پر اُن
کے ایک ہم سفر نے ان سے درخواست کی کہ وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر کچھ فرمائیں۔
اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں وہ قرآن کی آیتیں بھی پڑھتے تھے۔ بعض ہندوؤں اور
مسلمانوں کو اس پر اعتراض تھا۔ ہندو مذہب سے متعلق اُن کے نظریے باغیانہ
تھے اور وہ ذاتوں کی نابرابری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے پرانے
خیالات کے کٹر ہندو اُن سے خفا تھا۔ ان لوگوں نے کالے جھنڈوں سے
مظاہرہ کر کے، جوتوں کا ہار پہنا کر ان کی توہین کی اور انھیں مار ڈالنے کی کوشش
کی۔ پھر بھی انھوں نے کہا "اگر چھوت چھات ہندو مذہب کا جزو ہے تو میں
ہندو ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ اگر انسانیت پر سے یہ داغ ختم نہیں ہوتا تو
ہندو مذہب کو باقی نہیں رہنا چاہئے۔ ہمارے مذہب کی بنیاد عدم تشدد پر ہے
ور عدم تشدد محبت کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور محبت بھی صرف اپنے پڑوسیوں
ور دوستوں سے نہیں بلکہ اُن سے بھی جو شاید ہمارے دشمن ہوں۔" ایسے مندر میں
جس کے دروازے سب کے لئے نہ کھلے ہوں وہ نہیں جاتے تھے۔ برسوں کی
کوششوں کے بعد ہریجنوں کے لئے بہت سے مندروں کے دروازے

کھلوانے میں انھیں کامیابی ہوئی۔

گاندھی جی سچائی کو خدا سمجھتے تھے اور مذہب کو زندگی میں سمونے اور اس پر بھروسہ کرنے کی چیز سمجھتے تھے۔ خدا ایک ایک قطرے اور ذرّے ذرّے میں موجود ہے۔ گاندھی جی بتوں کے بغیر عبادت کرنا زیادہ پسند کرتے تھے اگرچہ وہ بُت پرستی کے خلاف بھی نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "جو لوگ بتوں کو پوجتے ہیں وہ پتھر کو نہیں بلکہ اس خدا کو پوجتے ہیں جو اس میں بستا ہے" انھوں نے بُت پرستی کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ ٹیگور سے کہا تھا: "پیپل کے نیچے سیندور سے رنگا ہوا پتھر کا ایک ٹکڑا اچھوت کا دیوتا ہے اور اس کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یہی پتھر کا ٹکڑا اچھوتوں کو بھگوان سے ملاتا ہے جب تک آپ لنگڑے کو چلنا نہ سکھا دیں اس وقت تک اس کے ہاتھ سے بیساکھی چھیننے کی ہمت نہیں کرتے۔" انھیں پیڑوں کی پوجا میں بھی کوئی خرابی یا بُرائی نظر نہیں آئی۔ "مجھے تو اس کے پیچھے انتہائی محبت اور شاعری نظر آتی ہے۔ یہ پوری نباتاتی دنیا سے سچے احترام کی علامت ہے جس سے خدا کی شان اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔"

وہ 'گاندھی مندر' کھولنے کی خبر سُن کر بہت برہم ہوئے تھے اور آشرم میں اپنے پیروں کو چھونا جرم قرار دے دیا تھا۔

اس ولی صفت انسان نے اپنے ہم وطنوں کو ملک اور دُردناراتی کی

خدمت کے ایک نئے منتر سے روشناس کرایا۔ یہ منتر تھا آزادی، مساوات اور اخوت کا، یہ منتر تھا ذہنوں کو ہر طرح کے خوف اور غلامی سے آزاد کرنے کا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں، اپنے مختلف کاموں میں قربانی کے بہادرانہ جذبے کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ انھوں نے بار بار یہ کہا کہ بنی نوع انسان کو عدم تشدد کے ذریعہ ہی تشدد سے چھٹکارا پانا ہے اور صرف محبت کے ذریعہ ہی نفرت پر فتح پائی جا سکتی ہے۔

گاندھی جی نے بڑی مصروف زندگی بسر کی۔ انھوں نے گیتا کی اس تعلیم کو اپنی زندگی کا پہلا اصول بنا لیا تھا کہ جو شخص روزانہ جسمانی محنت (کرم یجنا) کیے بغیر کھانا کھاتا ہے وہ چوری کرتا ہے۔ روٹی کے لیے جسمانی محنت مشقت کو وہ کرم یجنا سمجھتے تھے۔ ان کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس میں انھوں نے کسی قسم کی جسمانی محنت نہ کی ہو۔ انھوں نے نہ کبھی جھوٹ بولا، نہ کبھی کسی جان دار مخلوق کو ستایا اور نہ کبھی بدگوئی کی۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے اٹھ جاتے تھے اور ہر روز صبح و شام پرارتھنا کرتے تھے۔ اپنی روز کی پرارتھنا میں وہ گیتا اور اپنشد قرآن اور ژند اوستا کے حصے پڑھتے تھے۔ وہ خواہ کہیں بھی ہوں، بحری جہاز میں یا چلتی ہوئی ریل گاڑی میں، کسی مسلمان، عیسائی یا اچھوت کے گھر میں ہوں یا گاؤں گاؤں پیدل جا رہے ہوں اپنے اس معمول کی سختی سے پابندی کرتے تھے جیل میں بھی انھوں نے اس معمول میں ڈھیل نہیں آنے دی۔ وہ اکیس دن تک

کھانا کھائے بغیر رہ سکتے تھے لیکن پرارتھنا کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتے تھے۔ اُن کے نزدیک عبادت دکھاوے کی چیز نہیں تھی بلکہ خدا پر مکمل اعتقاد کا نام تھا۔ وہ خدا کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنی پاکی کے لئے عبادت کرتے تھے۔ چھتیس سال کی عمر میں انھوں نے برہمچاری کی زندگی گزارنا شروع کی اور فینکس آشرم میں عام پرارتھنا کی ابتدا کی۔ وہاں ہر شام کو بھجن اور عیسائی مناجات گائی جاتی تھیں۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں پرارتھنا سبھاؤں میں شامل لوگوں سے وہ کہتے تھے کہ تالی کی گت پر رام دُھن گاؤ۔ ان کی خواہش تھی کہ سارے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ایسی پرارتھنا سبھائیں ہوں۔

گاندھی جی ریاکاری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن کسی کو اس کی خطاؤں پر سزا کبھی نہیں دیتے تھے۔ اگر کوئی جھوٹ بولتا یا غلطی کر بیٹھتا تو وہ خود اپنے نفس کی پاکیزگی کے لئے برت رکھتے تھے۔

اس پروہت نے ایک بار مندروں میں مورتیاں نصب کیں اور مندروں کا افتتاح بھی کیا۔ انھوں نے اسکولوں اور شفاخانوں کا سنگِ بنیاد رکھا۔ نواکھالی میں انھوں نے ایک مورتی کو جسے مسلمانوں نے نقصان پہنچایا تھا دوبارہ نصب کیا۔ انھوں نے دہلی میں لکشمی نارائن مندر، بنارس میں بھارت ماتا مندر، سیلو میں ہریجنوں کے لئے ایک مندر اور رتناگری میں ماروتی مندر کا افتتاح کیا تھا۔ رتناگری میں انھوں

نے کہا تھا "میں نے ماروتی کے بُت کو اس لئے نصب نہیں کیا ہے کہ وہ دیو جیسی قوت کا مالک ہے۔ ایسی قوت تو راون میں بھی تھی، لیکن ماروتی میں روحانی قوت تھی جو اس کے برہمچاری ہونے اور رام سے انتہائی عقیدت کا براہ راست نتیجہ تھی۔"

رام نام پہ گاندھی جی کا عقیدہ بڑا راسخ تھا۔ پرارتھنا سبھا میں جاتے ہوئے جب ایک متعصب (اور ظالم) ہندو نے انھیں گولی ماردی تو انھوں نے 'ہے رام' کہتے ہوئے جان دے دی۔

زندگی کے واقعات

گاندھی جی ۲؍اکتوبر سن ۱۸۶۹ء کو پوربندر میں پیدا ہوئے۔
سن ۱۸۸۳ء میں کستوربا سے شادی ہوئی۔
نومبر سن ۱۸۸۷ء میں میٹرک پاس کیا۔
اکتوبر سن ۱۸۸۸ء میں تعلیم حاصل کرنے لندن پہنچے۔
جون سن ۱۸۹۱ء میں بیرسٹر بنے۔
جون سن ۱۸۹۱ء میں ہندوستان واپس آئے۔
اپریل سن ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ کے لئے روانہ ہوئے۔
سن ۱۸۹۶ء اور سن ۱۹۰۱ء میں ہندوستان آئے۔
سن ۱۹۰۱ء میں پہلی بار انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی۔
سن ۱۹۰۳ء میں 'انڈین اوپینین' کی ذمہ داری سنبھالی۔
سن ۱۹۰۴ء میں فینکس کی بستی بسائی۔
سن ۱۸۹۹ء میں جنگ بوائر اور سن ۱۹۰۶ء میں زولو' بغاوت کے زمانے میں

انڈین ایمبولینس کور کی رہنمائی کی۔

۱۹۰۶ء میں برہمچاری کی زندگی کا آغاز کیا۔

۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۹ء میں انگلستان گئے۔

۱۹۰۸ء میں پہلی بار جنوبی افریقہ میں قید ہوئے۔

۱۹۱۰ء میں ٹالسٹائے فارم کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۳ء میں جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہیوں کی یاترا کی رہنمائی کی۔

۱۹۱۴ء میں جنوبی افریقہ چھوڑا اور جنوری ۱۹۱۵ء میں ہندوستان پہنچے۔

۱۹۱۵ء میں سابرمتی آشرم، ۱۹۳۳ء میں واردھا آشرم اور ۱۹۳۶ء میں سیواگرام آشرم کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۷ء میں چمپارن کی ستیہ گرہ شروع کی۔

۱۹۱۸ء میں کھیڑا میں پہلی ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع کی۔

۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جلیان والا باغ میں قتل عام ہوا۔

۱۹۱۹ء میں 'ینگ انڈیا' اور 'نوجیون' کے ایڈیٹر بنے۔

۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک چلائی۔

۱۹۲۲ء میں پہلی بار ہندوستان میں قید ہوئے۔

۱۹۲۷ء میں کھادی کے لئے سفر کیا۔

۱۹۳۰ء میں ڈانڈی یاترا اور نمک کی ستیہ گرہ کی رہنمائی کی۔

۱۹۳۱ء میں دوبارہ یورپ گئے اور لندن میں گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔

۱۹۳۳ء میں ہفتہ وار اخبار "ہریجن" نکالنا شروع کیا۔

۱۹۳۷ء میں نئی تعلیم کی سرپرستی کی۔

۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا آغاز کیا۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک آغا خاں محل میں آخری بار قید ہوئے۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو شہید کر دیئے گئے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

راجہ رام موہن رائے

مصنف: سچندر لال گھوش

مترجم: انعام الحق

صفحات: 112

قیمت: -/16 روپے

ڈاکٹر راجندر پرشاد

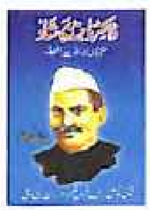

مصنف: عبداللطیف اعظمی

صفحات: 41

قیمت: -/10 روپے

پریم چند

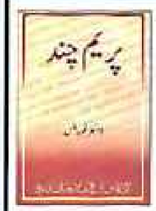

مصنف: قمر رئیس

صفحات: 70

قیمت: -/31 روپے

بچوں کے حالی

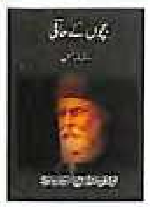

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

صفحات: 63

قیمت: -/11 روپے

اقبال اور بچوں کا ادب

مصنفہ: زیب النساء بیگم

صفحات: 216

قیمت: -/60 روپے

خواجہ میر درد

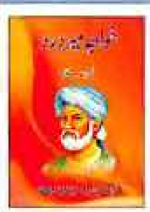

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

صفحات: 64

قیمت: -/11 روپے

ISBN 978-81-7587-573-9

₹ 27.00

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025